سعادت حسن منٹو
سرکنڈوں کے پیچھے

# سرکنڈوں کے پیچھے

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعر و ادب سمن آباد - لاہور



ناشر : نواز چودھری

مطبع : ندرت پرنٹرز - لاہور

قیمت : اکیس روپے

# ترتیب

# "بلونت سنگھ مجیٹھیا"

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سید ہیں اور میرے دور دراز کے رشتہ دار بھی ہیں۔ وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سید تھے اور میں ایک محض کشمیری۔

بہرحال ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انہوں نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔



یہ کتابیں جو کہ افسانوں کے مجموعے تھیں، انہوں نے پڑھیں اور مجھے بہت تعجب ہوا کہ انہوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے یہ افسانے ایسے تھے جو ادبی دنیا میں شاہکار تسلیم کئے جا چکے تھے۔

شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انہوں نے ایک مکان الاٹ کرا رکھا تھا۔ لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس لئے انہوں نے اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی بیٹھک کا انتظام کیا تھا۔ اوپر زنانہ تھا، شاہ صاحب کے دوست یار بے شمار تھے اس لئے اس گیراج میں وہ ان کی خاطر مدارات کرتے تھے۔

ایک دن ان سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا "میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے ہو۔"

میں ہر وقت افسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا "مجھے امید ہے کہ آپ کچھ مواد دیں گے!"

شاہ صاحب نے جواباً کہا "میں افسانہ نگار نہیں ـــــ لیکن
میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابلِ ذکر ہے ـــــ میں نے
قابلِ ذکر اس لئے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں سعدہ
یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے والا ہوں میرے نزدیک بیحد حیرت انگیز
ہے"

میں نے شاہ صاحب سے کہا "ایسا بھی کیا حیرت انگیز ہوگا؟"
پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس میں تھوڑی سی اصلاح کی "لیکن
ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے وہ واقعی حیرت انگیز ہو"
شاہ صاحب نے کہا "جی! میں نہیں کہہ سکتا کہ جو قصہ میں آپکو
سُنانے والا ہوں، ہر شخص کے لئے حیرت کا باعث ہوگا ـــ میں صرف
اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں ـــ اور یہ حقیقت
ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں
غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے"
شاہ صاحب نے "نیل کٹر" سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کئے
میں ان کی داستان سُننے کے لئے بے تاب تھا، مگر شاید وہ آغاز کے
متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کو کہاں سے شروع کریں۔



میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا تھا اس کو کئی برس ہو چکے تھے
وہ تمام واقعات کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔
میں نے سگرٹ سلگایا۔ انہوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن
کاٹ کر "نیل کٹر" تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے "میں ان دنوں
کابل میں تھا" یہ کہہ کر وہ چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے
"میری وہاں بہت بڑی دکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود
رہتا تھا"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "آپ جنرل مرچنٹ تھے؟"
شاہ صاحب نے جواب دیا "جی ہاں ـــــ کابل کا سب سے
بڑا جنرل مرچنٹ ـــ میری دکان میں کابل کی قریب قریب ہر عورت سودا
لینے آتی تھی ـــــ آپ سے میں ایک بات عرض کروں ـــــ
ساتھ کے دکاندار جب یہ دیکھتے تھے کہ کسی روز عورتوں کی بجائے میری
دکان میں مرد گاہک آئے ہیں تو وہ مجھ سے فارسی زبان میں افسوس کا
اظہار کرتے تھے کہ آغا آج کیا ہوا ـــ کابل کی عورتیں اور لڑکیاں
مر گئیں یا تمہارے نصیب سو گئے ہیں"
شاہ صاحب مسکرا دیتے تھے ـــــ اس کے علاوہ اور وہ

کیا جواب دے سکتے تھے۔ لیکن ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ
ان کی دکان میں گاہکوں کی اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے، اور
وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب ان کی چرب زبانی کا معجزہ ہے۔

انھوں نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں بہترین سیلزمین ہوں
خاص طور پر عورتوں کے ساتھ تو میں اس طرح سودا کر سکتا ہوں کہ
یہاں لاہور میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ بی اے ہوں ـــــ تھوڑی بہت
سائیکلوجی بھی میں نے پڑھی ہے، اس لئے مجھے معلوم ہے کہ عورتوں
سے کس طرح "ڈیل" کیا جا سکتا ہے ـــــ یہی وجہ تھی کہ سارے
کابل میں میری دکان ہی ایسی تھی جس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی گاہک موجود
رہتا تھا۔"

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا "یقیناً
آپ بہترین سیلزمین ہیں کہ آپ کی گفتگو کا انداز ہی اس کا ثبوت ہے"
شاہ صاحب مسکرائے "مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان
بہترین سیلزمین کے انداز بیان میں بیان نہیں کر سکوں گا"
میں نے ان سے کہا "آپ شروع کیجئے"
شاہ صاحب نے چند لمحات اپنے حافظے کو ٹٹولا اور اپنی داستان



شروع کی "منٹو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا
ہوں، میں کابل میں تھا۔ یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری
صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں مگر اس
زمانے میں میرا جسم آج کے مقابلے میں دوگنا تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا
سینکڑوں ڈنڑ پیلتا تھا، مگدر گھماتا تھا۔ سگرٹ پیتا تھا نہ شراب، بس
ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ افغانی نہیں، ہندوستانی، چنانچہ میں
امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو
ہر روز میرے لئے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا
میری زندگی بڑی ہموار گذر رہی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بنک میں
لاکھوں افغانی روپے جمع تھے ـــــ لیکن ـــــ"

شاہ صاحب تھوڑی سی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے
پوچھا "لیکن کہہ کر آپ چپ ہو گئے ـــــ اس کا یہ مطلب نہیں
نکلتا کہ آپ پھر بھی ناخوش تھے"

شاہ صاحب نے اعتراف کیا "جی ہاں! میں ان تمام آسائشوں
کے باوجود ناخوش تھا ـــ اس لئے کہ میں اکیلا تھا ـــ مجرد تھا۔
اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ، نہ آتیں تو بہت ممکن ہے کہ

مجھے اپنے تجرد کا احساس نہ ہوتا ـــــ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا
کابل کی ہر صاحبِ ثروت عورت میری دکان میں آتی تھی ـــــ دکان
میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقعہ اتار کر ایک طرف
رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہو جاتیں ـــــ مفتی صاحب!
آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی مگر حقیقت
اس کے برعکس ہے۔ یوں تو وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں
مگر لباس لیٹیسٹ یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ کٹے ہوئے بال رنگے ہوئے
ناخن، پنڈلیاں ننگی ـــــ جب وہ میری دکان میں آتی تھیں تو اپنے برقعے
اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہو جاتی تھیں"

شاہ صاحب نے یہ بیان کیا تو میں نے ان سے پوچھا "آپ کو
ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہو گئی ہو گی"

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہو گئے "جی ہاں! ایک لڑکی سے
ہو گئی تھی، جو اپنا برقعہ نہیں اتارتی تھی، حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اٹھاتی تھی"

میں نے ان سے پوچھا "کون تھی وہ؟"

انھوں نے جواب دیا "ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔
اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑا سخت گیر ـــــ مجھے اس سے محبت



اس لئے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں
دکھاتی تھی"

میں نے پوچھا "اس کی وجہ؟"

شاہ صاحب نے کہا "مجھے معلوم نہیں اور نہ میں نے اس سے
کبھی اس بارے میں استفسار ہی کیا ـــــ لیکن میرے تصور میں وہ انتہا
درجے کی حسین تھی۔ گوری چٹی ـــــ جسم خواہ برقعے میں لپٹا ہو، لیکن اس کے
تناسب کے متعلق اندازہ لگانا کوئی اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا ـــــ میں نے
چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آدرش مجسمہ ہے ـــــ لیکن
مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لئے میری دکان میں آتی تھی، چیزیں
خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں چند منٹ
صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "یہ سلسلہ کب تک جاری
رہا ـــــ؟"

"قریب قریب چھ مہینے تک ـــــ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں
تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ میں اس سے بہت
مرعوب تھا، اس لئے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھی۔ اس میں ایک

عجیب قسم کی رعونت تھی ۔۔۔ میں اس کو بے طرح گھورتا تھا، حالانکہ یہ
شائستگی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا ۔۔۔ منٹو صاحب!
ایک دن میں دکان میں بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی
گھنٹی بجی۔ نوکر نے ریسیور اُٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے
بات کرنا چاہتی ہیں ۔۔۔ میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہوگی اور نئے
مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوگی۔ اٹھ کر میں نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور
پوچھا "مادام آپ کیا چاہتی ہیں؟" اُدھر سے آواز آئی "کیا آپ سید
مظفر علی ہیں؟" میں نے جواب دیا "جی ہاں ۔۔۔ ارشاد!" ۔۔۔ اب
میں نے آواز پہچان لی تھی ۔۔۔ یہ اسی کی تھی ۔۔۔ اسی کی جو میری دکان
میں بُرقع نہیں اتارتی تھی ۔۔۔ میں گھبرا گیا ۔۔۔ منٹو صاحب! یہ عاشق
ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے"

یہ سن کر میں مسکرا دیا "آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب ۔۔۔
لیکن افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا"

شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا "حد ہو گئی ہے ۔۔۔ انسان اپنی
جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہوتا ہے ۔۔۔ خیر!
آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ یہ آفت جلد ہو جائے،



کیونکہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے"

میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا "آپ اپنی داستان بیان
کیجیے ۔۔۔ مجھے عشق ہوگا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو
اس کی پوری روداد سنا دوں گا"

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنگڑی پر لیٹ گئے اور آنکھیں
بند کر لیں "منٹو صاحب ۔۔۔ میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح
گرفتار ہوا کہ ورزش کرنا بھول گیا ۔۔۔ وہ میری دکان پر اکثر آتی تھی
۔۔۔ میں اس کو گھورتا تھا ۔۔۔ لیکن دیکھیے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا ہے
یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے ۔۔۔ میں آپ سے اس کے
ٹیلیفون کی بات کر رہا تھا ۔۔۔ جب میں نے ریسیور اُٹھایا اور اس کی
آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا "دیکھو میں جب بھی تمہاری
دکان میں آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو
ٹھیک ہو جاؤ ورنہ تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا" ۔۔۔ منٹو صاحب
میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں دیر تک گم سم ریسیور کو کان کے ساتھ لگائے کھڑا رہا اور سوچتا رہا
کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "کیا وہ دھمکی اصلی تھی؟"
"جی ہاں ــــ چوتھے روز وہ میری دکان میں آئی تو میں نے
اس کی نقاب کی طرف پھر انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر
میرے ملازموں کے سامنے مجھ سے کہا ــــ تمہیں شرم نہیں آتی
کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہو ــــ میں سُن ہو گیا ــــ لیکن اس نے
چند چیزیں خریدیں۔ دام دیئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی"

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔ کہا:
"عجیب لڑکی تھی ــــ آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے
باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی"

شاہ صاحب نے آنکھیں کھول لیں "منٹو صاحب! یہی وجہ تھی کہ
میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت و حقارت مصنوعی ہے
دراصل وہ میری محبت سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے
طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے ــــ لیکن جب ایک روز اس نے مجھے
بہت زور سے جھڑکا تو میرے جنون کی ترنگیں سرد ہو گیا ــــ پر اس کی محبت تھی
جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی ــــ میں نے بہت کوشش
کی کہ اس کو بھول جاؤں ــــ میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بیوقوف



ہو۔ ایک لڑکی جس کی تم نے شکل نہیں دیکھی ــــ جو تم سے نفرت کرتی
ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔ باز آؤ، تمہارا کاروبار ماشاءاللہ
بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری ساکھ ہے۔ یہ کیا
جھک مار رہے ہو ــــ لیکن منٹو صاحب عشق بہت بُری بلا ہے
میں اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا ــــ"

میں نے ان سے کہا "آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے
جا رہے ہیں۔ انجام پر پہنچئے"

شاہ صاحب پلنگڑی پر سے اُٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے "منٹو صاحب
ایسی داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے۔ اور
جب تک طول نہ پکڑے مرض نہیں ہوتا، محض ایک مذاق ہوتا
ہے ــــ خیر، اب جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل
نہ بناؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت
اختیار کر گیا تو ایک روز میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر امرتسر
کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو جھبیلے کے ایک اچھے خاندان
کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجینئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے
والا آدمی تھا، اس نے ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے

جاتا تھا۔ مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دکان میں آیا جب کہ میری آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا۔ لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا "دوست تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے" تو میں چونک پڑا! نہیں نہیں — ایسی کوئی بات نہیں — سردار بلونت سنگھ بیٹھا اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا — تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ تمہیں یہاں کسی سے عشق ہوا ہے — میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا "دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دیں گے — جب اس نے اسی قسم کی چند اور باتیں کیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا"

میں نے پوچھا "تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گُر بتایا؟"

شاہ صاحب نے کہا "اس نے مجھے ایک منتر بتایا"

"منتر؟"

"جی ہاں!"

"آپ سیّد ہیں — کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لا سکتے ہیں؟"

شاہ صاحب نے کہا "لانا تو نہیں چاہیے تھا کہ یہ ہمارے



مذہب میں جائز نہیں — لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لئے کہ عشق بُری بلا ہے — اس نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ہر ایک پر منتر پڑھ کر پھونکو اور شگل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھا دو — یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے"

میں نے ان سے کہا "ذرا سنائیے تو"

شاہ صاحب نے ایک لمحے کے لئے اپنے حافظے کو حرکت دی اور کہا:۔

کورو دس کھیا دیری
پھُل کھڑے پھُل بجے
پھُل چنگے نا ہر سنگھ پیارے
جو کٹی نے پھُلوں کی باس
کبھی نہ چھوٹے ہمارا ساتھ
نہیں چھوڑ کسی اور کو کرے
پیٹ پھُل بھسم ہو مرے
واہ نی سلیمان پیغمبر کی!

میں نے یہ منتر سُنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب میں نے
منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس
غرض سے کیا تھا کہ میں اسکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا
جاؤں —— یہ منتر مجھے اب تک یاد ہے —— اونگ فاکا رشی
اُٹھا دے بھرینگ پراسواہ —— لیکن اس کے پڑھنے کا
نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔

میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے
پوچھا "تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟"

"جی ہاں —— میں نے سات رنگ کے پھول منگوا
کر اکٹھے کئے۔ ان پر یہ منتر پڑھا اور اس لڑکی کو ٹیلیفون کیا کہ میری
دکان میں چیکوسلوواکیا سے بہت اچھا مال آیا ہے۔ منگل کو وہ آ کے
دیکھ لے"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "کیا وہ آئی؟"

"جی ہاں —— وہ آئی —— اس نے مجھے ٹیلیفون
پر کہہ دیا تھا کہ وہ آئے گی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب۔ میں اس
کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے



چیکوسلوواکیا کے نئے مال کے متعلق استفسار کیا۔ غرض یہ ہے کہ
مال وال کا قصہ بالکل فراڈ تھا —— میں نے اس سے کہا کہ ملازموں
نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لائیے گا۔ وہ
بہت جز بز ہوئی۔ میں منتر پڑھے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا ——
اتفاق کی بات کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے
کہا، یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آ گئے؟ —— میں نے جواب
دیا، یہ میں نے آپ کے لئے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں
—— میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو۔ تو آپ انہیں
قبول فرمائیں —— اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انہیں سُونگھا"

میں نے ان سے پوچھا "اس لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا
—— یہ پھول ہیں؟ —— ان میں تو خوشبو ہے نہ بدبو —— بہر حال
اس نے وہ پھول سُونگھے —— چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی ——
شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا میری دکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے
پوچھا —— کہ وہ پھول سُنگھا دیئے؟ میں نے اس سے کہا،
سُنگھا تو دیئے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ مجھے معلوم نہیں۔

سردار بلونت سنگھ ہنسا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا
"دوست! اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا ہے۔"

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے سے ایسا کام پندرہ آنے کیونکر ہو سکتا ہے، مگر سید صاحب نے کہنا شروع کیا "منظور صاحب! آپ یقین مانئے کہ میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا ۔۔۔ دوسرے دن گوگو جان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لئے آ رہی ہے۔ میں نے اس کا استقبال کیا ۔۔۔ وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "تم سے میں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو ۔۔۔ اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے، اس کا کیا مطلب تھا ۔۔۔"

میں نے گوگو جان سے لکنت بھرے لہجے میں کہا "میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ وہ پھول جو تھے ۔۔۔ پھول تھے ۔۔۔ میں نے ۔۔۔ میں نے ۔۔۔ مال جو چکوسلواکیہ سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا، اس لئے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے ۔۔۔ گوگو جان غصے میں سخت مضطرب تھی ۔۔۔ اس نے اضطراب بھرے لہجے



میں کہا "تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے؟" ۔۔۔ میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا "کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی ۔۔۔؟" وہ بڑے گرم انداز میں بولی "تکلیف ۔۔۔؟ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں ۔۔۔ پھول آتے تھے اور جب میں انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے پرے ہٹ جاتے تھے ۔۔۔ یہ کیسے پھول تھے؟" میں نے جواب دیا "میرے وطن کے تھے ۔۔۔ چونکہ میرے وطن کے تھے اس لئے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ۔۔۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے تھے؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "جی! منگوائے کہاں سے تھے، وہیں افغانستان کے تھے ۔۔۔ نہایت واہیات قسم کے پھول، جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی ۔۔۔ شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لئے۔ اس نے مجھ سے قرض لینے سے پہلے دریافت کیا "کہئے شاہ صاحب، اس معاملے کا کیا ہوا؟" میں نے

اس کو ساری بات بتا دی —— وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھرا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مار کر چلایا —— "شاہ جی، آپ کا کام سولہ آنے ہو گیا ہے —— وسکی کی ایک بوتل منگا دیجیے"

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے وسکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ سگرٹوں کا بھی منگا لیا جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا تمباکو نوشوں کے ٹھیٹ انداز میں پے در پے کئی سگرٹ پھونکتے رہے۔ جب جانے لگے تو انہوں نے شاہ صاحب سے کہا "دیکھو ابھی تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ لگے ہاتھ کل کو تم اور سات پھول لو اور ان پہ دیا منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھا دو —— بیڑا پار ہو جائے گا۔"

شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی کوکو جان کو پھول کیسے سنگھا سکیں گے جب کہ وہ اس معاملے کے متعلق شاکی تھی۔ لیکن معاملہ عشق کا تھا، اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔

شاہ صاحب نے پشاور سے پھول منگوائے —— ان میں سے سات منتخب کیے۔ اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلدان میں رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی دکان میں جابجا گلدان



رکھوائے اور ان میں پھول سجا دیئے۔

پیر کو شاہ صاحب نے کوکو جان کو ٹیلیفون کیا اور اس سے پھر جھوٹ بولا کہ چیکوسلواکیا کا مال نکل گیا ہے، آپ آئیے اور دیکھ لیجیے۔ کوکو جان آئی، مگر مال وال موجود نہیں تھا —— شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے بوکھلائے، پھر ذرا ہوش سنبھال کر اپنے نوکروں کو لعن طعن کی کہ تم نے ابھی تک مال کیوں نہیں کھولا۔

کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بوبو جان بھی تھی۔ وہ ایک طرف ٹائلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب دکان میں جابجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔

میرے میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی۔ گلدان میں سے اٹھا کر اس نے انہیں سونگھا اور مجھ سے کہا "یہ افغانستان کے پھول نہیں"

میں نے جواب دیا "جی ہاں —— یہ میرے وطن کے ہیں —— اور میں نے خاص آپ کے لیے منگوائے ہیں۔ بوبو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی۔ اس دوران میں کوکو جان سے میں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ

چلی گئی ــــ شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا آیا ــــ اس سے
بات چیت ہوئی۔ میں نے اس کو دس روپے قرض دیئے۔ جب اس
نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا "آج منگل ہے
ــــ وہ پھول سنگھا دیئے تھے آپ نے ؟ ــــ میں نے سارا واقعہ
بیان کر دیا ــــ سردار بلونت سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے
میرے ہاتھ پر مارا اور کہا "شاہ جی! اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے
ــــ وسکی کی ایک بوتل منگاؤ۔"

شاہ صاحب نے وسکی کی بوتل منگائی۔ سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا
نے آدھی دکان میں پی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب
سے پوچھا "دوسری دفعہ پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "وہ بہت بے چین ہو گئی۔ اسے
دن رات اپنے پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب
کی حالت میں آئی۔ برقع جو اس نے کبھی اُتارا نہیں تھا، کیلے کے چھلکے
کی طرح اُتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی "دیکھو شاہ!
تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے ــــ میں نے اس کے چہرے
کی طرف دیکھا جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا ... منٹو صاحب! میں نے



اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی ــــ میں اس
کو دیکھتا رہا ــــ اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا "تم نے مجھے
پھول کیوں سنگھائے تھے ــــ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں ــــ
دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ تمہارے پھول دکھائی دیتے ہیں، مجھے
معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے
کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں، میرے والدین عنقریب
میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونکا ہے ــــ"
یہ کہہ کر اس نے میرے میز پر سے گلدان میں سے پھول نکالے اور
فرش پر پھینک کر اپنی سینڈل سے مسل دیئے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس
ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی
کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لئے
میں خاموش رہا ــــ وہ کچھ دیکھنے کی حالت میں کھڑی رہی، اس کے
بعد اس نے برقع پہنا اور چلی گئی۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "تو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا کا
منتر کام کر گیا!"

"جی ہاں کام کر گیا ــــ اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے

میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے، مگر گرو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے، حالانکہ جو منتر آپ سُن چکے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کریگا —— لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جب پھر میری دکان میں آئی تو برقع اتار کر مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا —— میں نے اس کو کئی مرتبہ چوما۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے اس نے نکالے اور انہیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقع پہن کر تیزی سے باہر نکل گئی۔"

داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا "آپ مختصراً فرمائیے کہ انجام کیا ہوا؟ —— کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری "جی نہیں۔ اس کی شادی ہو گئی۔ مگر حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی —— اس کے ہاتھ میں سات پھول تھے مختلف رنگوں کے۔"



میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پلنگڑی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے پھولدان میں سات مختلف رنگوں کے پھول اُڑسے ہوئے تھے۔

# آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں!
یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی
ہیڈ لائٹس، جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا
کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں۔ میں خوبصورتی اور
بدصورتی میں تمیز کر سکتا ہوں۔ لیکن معاف کیجئے گا، ان آنکھوں کے معاملے
میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں تھیں، لیکن اس
کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔

میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس



ہسپتال کا نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس سے میرے
اس افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

بس آپ یہی سمجھ لیجئے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز
اوپریشن کرانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

یوں تو میں تیمارداری کا قائل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو
دم دلاسہ دینا بھی مجھے نہیں آتا۔ لیکن اپنی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے جانا
پڑا، تاکہ میں اپنے مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور اپنی محبت کا
ثبوت دے سکوں۔

یقین مانئے کہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے نام
ہی سے مجھے نفرت ہے، معلوم نہیں کیوں۔ شاید اس لئے کہ ایک بار
بمبئی میں اپنی بڈھی ہمسائی کو جس کی کلائی میں موچ آگئی تھی، مجھے جے
جے ہسپتال میں لے جانا پڑا تھا۔ وہاں کیژوالٹی ڈیپارٹمنٹ میں
مجھے کم از کم ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہاں میں جس آدمی سے
بھی ملا، لوہے کے مانند سرد اور بے حس تھا!

میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔
پسند کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے اگر آپ

یہ آنکھیں دیکھتے تو آپ کے دل و دماغ میں کوئی رد عمل پیدا نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے اگر ان کے بارے میں رائے طلب کی جاتی تو آپ کہہ دیتے "نہائیت واہیات آنکھیں ہیں" لیکن جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا، تو سب سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اُٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی ایک بوتل تھی اور وہ جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رُک گئے۔ وہ بھی ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا "تم سے چلا نہیں جاتا!"

لڑکے نے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی سے کہا "چل تو رہا ہوں۔ تو تو اندھی ہے!"

میں نے یہ سُنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں۔



میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا "ایکس رے کہاں لیا جاتا ہے؟"

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ایکس رے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا "آؤ، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں"

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادقؔ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکس رے لینے میں مصروف ہیں۔

دروازہ بند تھا اور باہر مریضوں کی ایک بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز و تند آواز آئی "کون ہے ___ دروازہ مت ٹھوکو" لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے دیتے رہ گیا "اوہ ___ تم ہو!"

"ہاں بھئی ___ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو"

"آجاؤ اندر!"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور ماں سے کہا "آؤ ——— لیکن لڑکے کو باہر رہنے دو!"

ڈاکٹر صادق نے پہلے سے مجھ سے پوچھا "کون ہے یہ؟"

میں نے جواب دیا "معلوم نہیں، کون ہے ——— ایکس رے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا چلو، میں لئے چلتا ہوں؟"

ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔

چار پانچ مریض تھے۔ ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکریننگ کی، اور انہیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دو رہ گئے میں اور وہ لڑکی۔

ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا "انہیں کیا بیماری ہے؟"

میں نے اس لڑکی سے پوچھا "کیا بیماری ہے تمہیں؟ ——— ایکس رے کے لئے تم سے کس ڈاکٹر نے کہا تھا؟"

اندھیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا "مجھے معلوم نہیں، کیا بیماری ہے ——— ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے۔



اس نے کہا تھا کہ ایکس رے لو؟"

ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئیے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرا گئی۔ ڈاکٹر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔ "کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟"

لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے اس کا برقع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوئچ آن کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے سوئچ آف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا "چھاتی بالکل صاف ہے۔"

لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی تھیں دوپٹے کو درست کیا اور برقع ڈھونڈھنے لگی۔

برقع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے برقع اوڑھتے ہوئے جواب دیا: "جی میرا نام —— میرا نام حنیفہ ہے۔"

"حنیفہ!" ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی "جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھا دینا۔"

لڑکی نے پرچی لی اور قمیص کے اندر اپنی انگیا میں اُڑس لی۔

جب وہ باہر نکلی تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے۔ حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا —— سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آگئی تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ جب وہ تانگوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے حنیفہ سے پوچھا "تمہیں کہاں جانا ہے؟"

اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا: "مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہے —— میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔"



میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تانگے میں بٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری آنکھیں ایکس ریز کا شیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا تھا —— صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا —— لیکن اس کی آنکھیں —— وہ بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھوں، لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دیکھ لے گا، میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلا تو حنیفہ مجھ سے مخاطب ہوئی: "تم کون ہو؟"

"میں —— میں سعادت حسن منٹو ہوں۔"

"منٹو —— یہ منٹو کیا ہوا؟"

"کشمیریوں کی ایک ذات ہے۔"

"ہم بھی کشمیری ہیں۔"

"اچھا؟"

"ہم گنگ وائیں ہیں!"

میں نے مڑ کر اس سے کہا: "یہ تو بہت اونچی ذات ہے۔"

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پرکشش ہو گئیں۔

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں لیکن وہ آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پرکشش تھیں، معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوبصورت نہیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب رہی تھیں۔

میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اُٹھایا اور اس کے سر پر چسپاں کر دی۔ اس نے بُرا نہ مانا۔

میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہوئی: "تم میرا ہاتھ کیوں دبا رہے ہو؟"

میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا: "تمہارا مکان کہاں ہے؟"

لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا: "اس بازار میں!"



تانگے نے اُدھر کا رُخ کیا۔ بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ ٹریفک بھی معمول سے زیادہ۔ تانگہ رُک رُک کے چل رہا تھا۔ سڑک میں چونکہ گڑھے تھے اس لئے بڑے زور کے دھچکے لگ رہے تھے۔ بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکراتا تھا، اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کا گھر آ گیا۔ لڑکے نے تانگے والے سے رُکنے کے لئے کہا۔ جب تانگہ رُکا تو وہ نیچے اُترا۔ حنیفہ بیٹھی رہی میں نے اس سے کہا: "تمہارا گھر آ گیا ہے۔"

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا "بدرو کہاں ہے؟"

میں نے اس سے پوچھا: "کون بدرو؟"

"وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا۔"

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا: "یہ کھڑا تو ہے!"

"اچھا ——!" یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا: "بدرو! مجھے اُتار تو دو۔"

بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا۔ پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا: "کیا بات ہے ـــــ یہ خود نہیں اتر سکتیں؟"

بدرو نے جواب دیا: "جی نہیں ـــــ ان کی آنکھیں خراب ہیں ـــــ دکھائی نہیں دیتا۔"

# "جاؤ حنیف جاؤ"

چودھری غلام عباس کی تازہ ترین تقریر پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا۔ ٹی ہاؤس کی فضا دوپہر کی چائے کی طرح گرم تھی۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ ہم کشمیر لے کر رہیں گے، اور یہ کہ ڈوگرہ راج کا فی الفور خاتمہ ہو جانا چاہئے۔

سب کے سب مجاہد تھے۔ لڑائی کے فن سے نابلد تھے مگر میدانِ جنگ میں جانے کے لیے سربکف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایکدم ہلّہ بول دیا جائے تو بس چٹکیوں میں کشمیر سر ہو جائے گا، پھر ڈاکٹر گراہم کی کوئی ضرورت نہ رہے گی، نہ یو این او میں ہر چھٹے مہینے گڑگڑانا پڑے گا۔

ان مجاہدوں میں میں بھی تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو
کی طرح میں بھی کشمیری ہوں۔ اس لئے کشمیر میری زبردست کمزوری ہے۔ چنانچہ
میں نے باقی مجاہدوں کی ہاں میں ہاں ملائی، اور آخر میں طے یہ ہوا کہ جب
لڑائی شروع ہو تو ہم سب اس میں شامل ہوں اور صفِ اوّل میں
نظر آئیں۔

حنیف نے یوں تو کافی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ
وہ افسردہ سا ہے۔ میں نے بہت سوچا مگر مجھے اس افسردگی کی کوئی وجہ
معلوم نہ ہو سکی۔

چائے پی کر باقی سب چلے گئے، لیکن میں اور حنیف بیٹھے رہے۔
اب ٹی ہاؤس قریب قریب خالی تھا ——— ہم سے بہت دور ایک
کونے میں دو لڑکے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

حنیف کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ مجھ سے قریب قریب دس
برس چھوٹا تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سوچ رہا تھا کہ اُردو کا ایم اے
کروں یا انگریزی کا۔ کبھی کبھی اس کے دماغ پر یہ خبط بھی سوار ہو جاتی کہ
بھاڑ میں جائے پڑھائی کو۔ سیاحی کرنی چاہیے۔

میں نے حنیف کو غور سے دیکھا۔ وہ ایش ٹرے میں سے ماچس کی



جلی ہوئی تیلیاں اٹھا اٹھا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں
پہلے کہہ چکا ہوں، وہ افسردہ تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر
وہی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، موقعہ اچھا ہے، اس
سے دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: "
تم خاموش کیوں ہو؟"

حنیف نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ماچس کی تیلی کے ٹکڑے کر کے
ایک طرف پھینکے اور جواب دیا: "ایسے ہی!"

میں نے سگرٹ سلگایا: "ایسے ہی تو ٹھیک جواب نہیں۔ ہر چیز کی
کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے ——— تم غالباً کسی بیتے ہوئے واقعے
کے متعلق سوچ رہے ہو!"

حنیف نے اثبات میں سر ہلایا: "ہاں!"

"اور وہ واقعہ کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے؟"

حنیف چونکا: "آپ نے کیسے جانا؟"

میں نے مسکرا کر کہا: "شریک ہو مزے ہوں میں بھی ——— ارے بھئی
کشمیر کی باتیں جو ہو رہی تھیں ——— جب تم نے مان لیا کہ سوچ رہے
ہو ——— کسی بیتے ہوئے واقعے کے متعلق سوچ رہے ہو تو میں فوراً

اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس بیتے ہوئے واقعے کا تعلق کشمیر کے سوا اور کسی سرزمین سے نہیں ہو سکتا ـــــ کیا وہاں کوئی رومان لڑا تھا تمہارا؟"

"رومان؟ ـــــ معلوم نہیں ـــــ جانے کیا تھا بہرحال کچھ نہ کچھ ہوا تھا جس کی یاد اب تک باقی ہے۔"

میری خواہش تھی کہ میں حنیف سے اس کی داستان سنوں۔ "اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہ کچھ نہ کچھ کیا تھا؟"

حنیف نے مجھ سے سگرٹ مانگ کر سلگایا اور کہا "منٹو صاحب کوئی خاص دلچسپ واقعہ نہیں ـــــ لیکن اگر آپ خاموشی سے سنتے رہیں گے اور مجھے ٹوکیں گے نہیں تو میں، آج سے تین برس پہلے جو کچھ ہوا آپ کو من وعن بتا دوں گا ـــــ میں افسانہ گو نہیں ـــــ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔"

میں نے وعدہ کیا کہ میں اس کے تسلسل کو نہیں توڑوں گا۔ اصل میں وہ اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنی داستان بیان کرنا چاہتا تھا۔

حنیف نے تھوڑے توقف کے بعد کہنا شروع کیا "منٹو صاحب! یہ آج سے دو برس پہلے کی بات ہے جب کہ بٹوارہ کسی کے وہم وگمان میں



بھی نہیں تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میری طبیعت اداس تھی۔ معلوم نہیں کیوں ـــــ میرا خیال ہے کہ ہر کنوارا نوجوان اس قسم کے موسم میں ضرور اداسی محسوس کرتا ہے ـــــ خیر ـــــ میں نے ایک روز کشمیر جانے کا ارادہ کر لیا۔ مختصر سا سامان لیا اور لاریوں کے اڈے پر جا پہنچا۔ ٹکٹ لیا۔ لاری جب کد پہنچی تو میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا سری نگر میں کیا دھرا ہے۔ بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں ـــــ اگلے اسٹیشن بٹوت پر اتر جاؤں گا۔ سنا ہے بڑا صحت افزا مقام ہے، تپ دق کے مریض یہیں آتے ہیں اور صحت یاب ہو کر جاتے ہیں ـــــ چنانچہ میں بٹوت اتر گیا اور وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا ـــــ ہوٹل بس ایسے ہی واجبی سا تھا۔ بہرحال ٹھیک تھا ـــــ مجھے بٹوت پسند آگیا۔ صبح چڑھائی کی طرف سیر کو نکل جاتا ـــــ واپس آکر خالص مکھن اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کرتا اور لیٹ کر کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔

دن اس صحت افزا فضا میں بڑی اچھی طرح گزر رہے تھے ـــــ آس پاس جتنے دوکاندار تھے، سب میرے دوست بن گئے تھے خاص طور پر سردار لہنا سنگھ جو درزیوں کا کام کرتا تھا۔ میں اس کی دکان پر

گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ عشق و محبت کے افسانے سُننے اور سُنانے کا اسے
قریب قریب خبط تھا۔ مشین چلتی رہتی تھی اور وہ بابو کوئی داستانِ عشق سُنا
رہتا تھا یا سُنتا رہتا تھا۔

اس کو شہر سے متعلق ہر چیز کا علم تھا۔ کون کس سے عشق لڑا
رہا ہے۔ کس کس کی آپس میں کھٹ پٹ ہوتی۔ کون کون سی لونڈیا
پر پُرزے نکال رہی ہے —— ایسی تمام باتیں اس کی جیب میں
ٹھنسی رہتی تھیں۔

شام کو میں اور وہ آستانی کی طرف سیر کو جاتے تھے اور بابا ہال کے
درّہ تک پہنچ کر پھر آہستہ آہستہ واپس چلے آتے تھے —— ہوٹل سے
آستانی کی طرف پہلے موڑ پر سڑک کے داہنے ہاتھ ٹین کے بنے ہوئے کوارٹر
سے تھے —— میں نے ایک دن سردار جی سے پوچھا کہ یہ کوارٹر کیا
رہائش کے لئے ہیں؟ میں نے اس لئے دریافت کیا تھا کہ مجھے وہ پسند
آگئے تھے —— سردار جی نے مجھے بتایا کہ ہاں رہائش ہی کے لئے ہیں
آج کل ادھر سرگودھے کے ایک ریلوے بابو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی
دھرم پتنی بیمار ہے —— میں سمجھ گیا کہ دق ہوگی —— خدا معلوم میں دق سے
اتنا کیوں ڈرتا ہوں —— اس دن کے بعد جب کبھی میں اُدھر سے گذرا



ناک اور منہ پر رومال رکھ کے گذرا۔ میں داستان کو طویل نہیں کرنا چاہتا قصّہ
مختصر یہ کہ ریلوے بابو جس کا نام کندن لال تھا اُسے میری دوستی ہوگئی اور
میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی بیمار بیوی کی کوئی پروا نہیں۔ وہ اس فرض کو
محض ایک فرض سمجھ کر ادا کر رہا ہے۔ وہ اس کے پاس بہت کم جاتا تھا
اور دوسرے کوارٹر میں رہتا تھا جس میں وہ دن میں تین مرتبہ فینائل چھڑکتا تھا
—— مریضہ کی دیکھ بھال اس کی چھوٹی بہن سُنتری کرتی تھی۔ دن رات یہ لڑکی
جس کی عمر بمشکل چودہ برس کی ہوگی اپنی بہن کی خدمت میں مصروف رہتی تھی۔

میں نے سُنتری کو پہلی مرتبہ گُرنالے پر دیکھا —— میلے کپڑوں کا
بڑا انبار پاس رکھے وہ نالے کے پانی سے غالباً شلوار دھو رہی تھی کہ میں
پاس سے گذرا۔ آہٹ سُن کر وہ چونکی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر
نمستے کہا۔ میں نے اس کا جواب دیا اور اس سے پوچھا —— تم
مجھے جانتی ہو؟ —— سُنتری نے باریک آواز میں کہا —— جی ہاں۔
آپ بابو جی کے دوست ہیں —— میں نے ذرا غور سے اس دُبلی پتلی
لڑکی کی طرف دیکھا —— میں نے ایسا محسوس کیا کہ مظلومیت ہے، جو
لڑکی سُنتری کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں
اور کچھ کپڑے دھو ڈالوں تاکہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مگر پہلی ملاقات

میں ایسی بے تکلفی نامناسب تھی

دوسری ملاقات بھی اسی نامے ہوئی۔ وہ کپڑوں پر صابن لگا رہی تھی تو میں نے اس کو نمستے کی اور چھوٹی چھوٹی پیڑھیوں کے بستر پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور وہ کسی قدر گھبرائی لیکن جب باتیں شروع ہوئیں تو اس کی یہ گھبراہٹ دُور ہو گئی اور وہ اتنی بے تکلف ہو گئی کہ اس نے مجھے اپنے گھر کے تمام معاملات بتانے شروع کر دیئے۔

باؤجی یعنی کندن لال سے اس کی بڑی بہن کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چلے تھے۔ پہلے برس میں تو باؤجی کا سلوک اپنی بیوی سے ٹھیک رہا۔ لیکن جب رشوت کے الزام میں وہ نوکری سے معطل ہوا تو اس نے اپنی بیوی کا زیور بیچنا چاہا ـــــ زیور بیچ کر وہ جوا کھیلنا چاہتا تھا کہ دوگنے روپے ہو جائیں گے۔ بیوی نہ مانی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس نے اس کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ سارا دن ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رکھتا اور کھانے کو کچھ نہ دیتا۔ اس نے مہینوں ایسا کیا۔ آخر ایک دن عاجز آ کر اس کی بیوی نے اپنے زیور اس کے حوالے کر دیئے۔ لیکن زیور لے کر وہ ایسا غائب ہوا کہ کچھ مہینے تک اس کی شکل نظر نہ آئی۔ اس دوران میں سُندری کی بہن فاقہ کشی



کرتی رہی۔ وہ اگر چاہتی تو اپنے میکے جا سکتی تھی۔ اس کا باپ مالدار تھا اور اس سے بہت پیار کرتا تھا، مگر اس نے مناسب نہ سمجھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کو دق ہو گئی۔ کندن لال جب چھ مہینے کے بعد اچانک گھر آیا تو اس کی بیوی بستر پر پڑی تھی ـــــ کندن لال اب نوکری پر بحال ہو چکا تھا ـــــ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا تو وہ گول کر گیا۔

سُندری کی بہن نے اس سے زیوروں کے بارے میں پوچھا، اس کا پتی گھر واپس آ گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ بھگوان نے اس کی سُن لی ـــــ اس کی صحت کسی قدر بہتر ہو گئی، مگر یہ "ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق" والا معاملہ تھا۔ ایک مہینے کے بعد اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی ـــــ اس اثنا میں سُندری کے ماں باپ کو پتہ چل گیا۔ وہ فوراً وہاں پہنچے اور کندن لال کو مجبور کیا کہ اپنی بیوی کو فوراً کسی پہاڑ پر لے جائے۔ خرچ وغیرہ کا ذمہ انہوں نے رکھا ـــــ کندن لال نے کہا چلو یوں ہی سہی، سُندری کو دل بہلاوے کے لئے ساتھ لیا اور بٹوت پہنچ گیا۔

یہاں وہ اپنی بیوی کی قطعاً دیکھ بھال نہیں کرتا تھا ـــــ سارا دن

باہر تاش کھیلتا رہتا۔ سمتری پر بیری کھانا پکاتی تھی، اس لئے وہ صبح شام
ہوٹل سے کھانا کھاتا۔ ہر مہینے سسرال لکھ دیتا کہ خرچ زیادہ ہو رہا ہے
چنانچہ وہاں سے رقم میں اضافہ کر دیا جاتا۔

میں داستان لمبی نہیں کرنا چاہتا ——— سمتری سے میری ملاقات
اب ہر روز ہونے لگی۔ نالے پر وہ جگہ جہاں وہ کپڑے دھوتی تھی بڑی
ٹھنڈی تھی ——— نالے کا پانی بھی ٹھنڈا تھا۔ سیب کے درخت کی
چھاؤں بہت پیاری تھی اور وہ گول گول بٹیاں، جی چاہتا تھا کہ سارا
دن انہیں اٹھا اٹھا کر نالے کے شفاف پانی میں پھینکتا رہوں ———
یہ تھوڑی سی بھونڈی شاعری میں نے اس لئے کی ہے کہ مجھے سمتری سے
محبت ہو گئی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس نے اسے قبول کر لیا ہے
——— چنانچہ ایک دن جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اسے اپنے
سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور
آنکھیں بند کر لیں۔ سیب کے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور
نگر نالے کا پانی گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔

وہ خوبصورت تھی، گو دُبلی تھی مگر اس طور پر کہ غور کرنے پر آدمی اس
نتیجے پر پہنچتا تھا کہ اسے دُبلی ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر وہ ذرا سی موٹی ہوتی



تو اتنے نازک طور پر خوبصورت نہ ہوتی ——— اس کی آنکھیں غزالی تھیں،
جن میں قدرتی سُرمہ لگا رہتا تھا ——— ٹھگنا سا قد ——— گھنے سیاہ بال
جو اس کی کمر تک آتے تھے ——— چھوٹا سا گنوارا جوبن ——— منٹو صاحب
میں اس کی محبت میں سر تا پا غرق ہو گیا۔

ایک دن جب وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی، میں نے
وہ بات جو بڑے دنوں سے میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی
تھی اس سے کہی کہ دیکھو سمتری! میں مسلمان ہوں تم ہندو ——— بتاؤ
انجام کیا ہو گا ——— میں کوئی اوباش نہیں کہ تمہیں خراب کر کے
چلا جاؤں۔ میں تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں ——— سمتری نے
میرے گلے میں باہیں ڈالیں اور بڑے مضبوط لہجے میں کہا حنیف!
میں مسلمان ہو جاؤں گی۔

میرے سینے کا بوجھ اتر گیا ——— طے ہوا کہ جونہی اس کی بہن
اچھی ہو گی وہ میرے ساتھ چل دے گی ——— اس کی بہن کو کہاں اچھا
ہونا تھا۔ کندن لال نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی موت کا منتظر ہے
یہ بات ٹھیک بھی تھی اگر اس طرح سوچا جاتا اس کا اعلان کرنا کچھ مناسب
نہیں تھا۔ بہر حال حقیقت سامنے تھی۔ کم بخت مرض ہی ایسا تھا کہ

بچنا محال تھا۔

سمتری کی بہن کی طبیعت دن بدن گرتی گئی ——— کندن لال کو کوئی پروا نہیں تھی ——— چونکہ اب سُسرال سے روپے زیادہ آنے لگے تھے اور خرچ کم ہو گیا تھا یا خود کم کر دیا گیا تھا، اس نے ڈاک بنگلے جا کر شراب پینا شروع کر دی اور سمتری سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

منٹو صاحب، جب میں نے یہ سُنا تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اتنی جرأت نہیں تھی ورنہ میں بیچ سڑک کے اس کی مرمت جوتوں سے کرتا ——— میں نے سمتری کو اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے آنسو پونچھے اور دوسری باتیں شروع کر دیں جو پیار محبت کی تھیں۔

ایک دن میں صبح سویرے سیر کو نکلا۔ جب ان کوارٹروں کے پاس پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ سمتری کی بہن اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کندن لال کو آواز دی۔ میرا خیال درست تھا۔ بے چاری نے رات گیارہ بجے آخری سانس لیا تھا۔

کندن لال نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر وہاں ٹھہروں تاکہ وہ کریا کرم کے لئے بندوبست کر آئے ——— وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد



مجھے سمتری کا خیال آیا ——— وہ کہاں تھی؟ جس کمرے میں اس کی بہن کی لاش تھی بالکل خاموش تھا ——— میں ساتھ والے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ اندر جھانک کے دیکھا سمتری چارپائی پر گٹھڑی سی بنی لیٹی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ اس کا کاندھا ہلا کر میں نے کہا، سمتری! سمتری ——— اس نے کوئی جواب نہ دیا ——— میں نے دیکھا کہ اس کی شلوار بڑے بڑے دھبوں سے بھری ہوئی ہے ——— میں نے پھر اس کا کاندھا ہلایا، مگر وہ خاموش رہی ——— میں نے بڑے پیار سے پوچھا کیا بات ہے سمتری ——— سمتری نے رونا شروع کر دیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا ——— کیا بات ہے سمتری ——— سمتری سسکیوں بھری آواز میں بولی ——— جاؤ حنیف ——— جاؤ ——— میں نے کہا کیوں ——— مجھے افسوس ہے کہ تمہاری بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ مگر تم تو اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا ——— اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی ——— وہ مر گئی ہے، پر میں اس کا غم نہیں کر سکتی ——— میں خود مر چکی ہوں ——— میں اس کا مطلب نہ سمجھا ——— تم کیوں مرو ——— تمہیں تو میرا جیون ساتھی بننا ہے۔ یہ سُن کر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی ——— جاؤ حنیف جاؤ ——— میں اب کسی کام کی نہیں رہی ——— کل رات ——— کل رات باوجی نے میرا خاتمہ کر دیا ——— میں چیخی ——— اُدھر دوسرے کوارٹر سے بھی چیخی اور مر گئی ——— وہ سمجھ گئی تھی۔

—— لے" کاش میں نہیں ہوتی۔ وہ مجھے کیا بچا سکتی تھی —— جاؤ حنیف
جاؤ —— یہ کہہ کر وہ اٹھی' دیوانہ وار میرا بازو پکڑا اور گھسیٹتی باہر لے گئی'
پھر وہ مڑ کر کوارٹر میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا —— تھوڑی دیر کے
بعد وہ حرامزادہ کندن لال آیا۔ اس کے ساتھ چار پانچ آدمی تھے۔ خدا کی
قسم اکیلا ہوتا تو میں پتھر مار مار کر اسے جہنم واصل کر دیتا —— بس یہ ہے
میری کہانی —— سُمتری کی کہانی جس کے یہ الفاظ ہر وقت میرے کانوں میں
گونجتے رہتے ہیں' جاؤ حنیف جاؤ —— کس قدر دکھ ہے ان تین
لفظوں میں ——"

حنیف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا
"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا —— تم نے سُمتری کو قبول کیوں نہ کیا؟"
حنیف نے آنکھیں جھکائیں —— خود کو ایک موٹی گالی دے کر
اس نے کہا "کمزوری —— مرد عموماً ایسے معاملوں میں بڑا کمزور ہوتا ہے
—— لعنت ہے اس پر ——"

# شادی

جمیل کو اپنا شیفر فاؤنٹین قلم مرمت کے لئے دینا تھا۔ اس نے
ٹیلیفون ڈائرکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم
ہوا کہ ان کے ایجنٹ میسرز ڈی جے ایمپورز ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے
پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچ کر اسے
میسرز ڈی جے ایمپورز کا دفتر تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا
مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے سے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی

چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔ جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا، کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی۔ منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ ٹھٹک کر اس نے لڑکی سے پوچھا "دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میرا خیال ہے۔"

لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا "میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا "مسٹر ۔۔۔ آج کل وار ہے وار ۔۔۔ یہ قلم امریکہ جائے گا ۔۔۔ تم نو مہینے کے بعد پتا کرنا۔"

جمیل بوکھلا گیا "نو مہینے!"

لڑکی نے اپنے کٹے ہوئے بالوں والا سر ہلایا ۔۔۔ جمیل نے لعنت کا ورد کیا۔



یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا ۔۔۔ نو مہینے ۔۔۔ اتنی مدت کے بعد تو عورت کل گرفتہ بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے ۔۔۔ نو مہینے ۔۔۔ نو مہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو ۔۔۔ اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لئے دیا تھا ۔۔۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا "یہ سب ڈھکوسلا ہے ۔۔۔ قلم میں معمولی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لئے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً جعلسازی تھی ۔۔۔ مگر پھر اس نے سوچا "لعنت بھیجو بھی اس قلم پر ۔۔۔ امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچھتر روپے میں خریدا تھا ۔۔۔ مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا ۔۔۔ ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے ۔۔۔ چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں۔ وسکی تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی" چنانچہ اس نے

قریب والی شراب کی دکان کا رُخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رُک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قدِ آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا۔ یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔

اس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر پڑی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا "یار اس مخملیں کا گھونگٹ تو کھولو ــــــ ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو"

جمیل مطلب سمجھ گیا۔ "تو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوائیے۔ پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے"

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے۔ پہلا دور ہوا۔ دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اُٹھا لایا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے



بڑی صاف اُردو میں چند ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور گلاس میں پٹیالہ پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا "سگریٹ نکالو یار!"

پیر صاحب میں ساتوں عیبِ شرعی تھے، مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لائٹر ـــ

اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا "مسٹر نٹور لال ـــ آپ موتیوں کی دلالی کرتے ہیں"

جمیل نے ایک لطیفے کے لئے سوچا "کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا ہے ـــ موتیوں کی دلالی میں ـــ"

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر جمیل مشہور سونگ رائٹر ـــ"

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہو گئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے ـــ میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے

اسے مُرتا بند ہو۔

مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نٹور لال کو معاف کر دیا۔ اور آخر میں اس سے کہا "مسٹر نٹور، اُٹھئے۔ ایک بوتل اور ہو جائے"

نٹور فوراً اُٹھا۔ اپنے سفید ڈھگلے کی شکنیں درست کیں۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا "چلئے!"

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا "ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں"

جمیل اور نٹور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نٹور نے کہا "مسٹر جمیل ۔۔۔ یہ دکان ٹھیک نہیں۔ ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے" یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا "کولابہ چلو!"

کولابہ پہنچ کر نٹور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا۔ جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا وہ تو مل نہ سکا۔ ایک دوسرا مل گیا جس کی نٹور نے بہت تعریف کی کہ نمبر ون چیز ہے۔

یہ نمبر ون چیز خرید کر وہ دونوں باہر نکلے ۔۔۔ ساتھ ہی بار تھی۔ نٹور رک گیا "مسٹر جمیل۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ ایک دو پیگ یہیں سے پی کر



چلتے ہیں"

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے کہ اس کا نشہ حالتِ نزع میں تھا۔ چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے "مسٹر نٹور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے"

نٹور نے زور سے آنکھ ماری "سب چلتا ہے"

اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا۔ جمیل بھی اس کے پیچھے ہو لیا ۔۔۔ نٹور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری "دیکھو، دو سوڈے، دو چز ۔۔۔ ٹھنڈے ۔۔۔ اور دو گلاس۔ ایک دم صاف"

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے۔ اس پر نٹور نے اسے دوسرا حکم دیا "فسٹ کلاس چپس اور ٹوماٹو سوس ۔۔۔ اور فسٹ کلاس کٹلس!"

بیرا چلا گیا۔ نٹور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا۔ بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ جو اس سے کچھ زیادہ۔ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔

تک پہنچ جاتی ہیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے ـــ مطلب ہے
ایسے علاقے میں ہے جو اپنے پر فتنہ (رقص خانوں) کی وجہ سے ساری بمبئی
میں مشہور ہے۔ جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر ہی کا رُخ کرتے
ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو لک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے
ان معلومات کی بنا پر اس نے شرو سے کہا "میں نے کہا ـــ وہ ـــ
وہ ـــ میرا مطلب ہے ادھر کوئی چھوکری وو کری نہیں ملتی؟"

شرو نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا "مسٹر جمیل!
ایک نہیں ہزاروں ـــ ہزاروں ـــ ہزاروں ـــ"

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی
نہ ہوتی "ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ شرو
بھائی نے کمال کر دیا!"

شرو بھائی مزے میں تھے جھوم کر کہا "جمیل بھائی ـــ ایک نہیں
ہزاروں ـــ چلو اس کو ختم کرو"

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر
دیا۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے!

"جمیل پیاسا تھا۔ ایک ہی جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا"
سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے ٹھسکیاں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے ـــ جمیل صبح گھر سے
ناشتہ کر کے نکلا تھا۔ لیکن بانڈی نے اسے بھوک لگا دی۔ چپس گرم گرم
تھے کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا ـــ شرو نے اس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ
میں دونوں پلیٹیں صاف!

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لیے پاپڑ بھی منگوائے۔
دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی۔ جمیل نے
سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے معرفت گھٹ رہے تھے۔ شرو اور جمیل
دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر الف لیلوی دنیا
میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انہیں عریاں بدن حسین عورتیں
ملیں۔ وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھائیں اور یہ جا وہ جا!

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا
تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے جس کو وہ
اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں

اندر اندھیرا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔
ایک لمحے کے لئے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز
روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نذرو سے کہا "چلو بھئی!"
نذرو نے تلاش لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا "مال پانی
ہے نا؟"
جمیل کے ہونٹوں پر شریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نذرو کی پسلیوں میں
کہنی سے ٹہوکا دے کر اس نے کہا "بہت۔ نذرو بھائی! بہت" اور
اس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے "کیا اتنے کافی نہیں؟"
نذرو کی باچھیں کھل گئیں "کافی ——؟ بہت زیادہ ہیں ——
چلو آؤ" پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی"
جمیل نے سوچا، بات بالکل ٹھیک ہے، وہاں ضرورت نہیں
پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی۔
ٹیکسی کھڑی تھی۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے
لگے۔

سینکڑوں بد قماش تھے۔ ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا،
مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی۔ سب میک اپ کی ہوئی اور شوخ تھوپ



کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان
معلوم نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے
ٹکڑوں پر بھدے اناڑی پن سے سرخی اور چونا لگایا گیا ہے۔
نذرو تنگ آگیا۔ اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل
کا کندھا پکڑ کر کہتا "جمیل بھائی، چلے گی!"
مگر جمیل بھائی اُٹھ کھڑا ہوتا "ہاں چلے گی —— اور ہم بھی چلیں گے!"
دو جگہیں اور دیکھی گئیں۔ مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ سوچتا
تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے، جو سوڈے کے سوکھے ہوئے گوشت
کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں۔ اُٹھنے
بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں، یعنی ایسی عورتیں
جو پردہ نشینی کراتی ہیں —— جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے
کہاں، جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔
جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیئے کہ نذرو نے
ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔
اب جمیل اکیلا تھا۔ ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔
اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے —— اس نے ڈرائیور سے پوچھا

"یہاں کوئی لونڈیا ملے گا؟"

ڈرائیور نے جواب دیا "ملے گا جناب!"

"تو چلو اس کے پاس!"

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھمائے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی — اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے، جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی آدھی بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔



اٹھ کر وہ اس گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اس سے کہا "کہئے مزاج کیسا ہے؟"

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا "کہئے آپ کا کیسا ہے!"

"ٹھیک ہوں!" یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔

"آپ کا نام؟"

"بتا تو چکی ایک دفعہ — آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے — جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نذر تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔"

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں — یا یوں سمجھئے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزا آتا ہے — وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو اڑتیس روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی "میرا نام تارہ ہے!"

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے تارہ سے کہا "سوڈا
یخ بستہ سوڈے اور گلاس"

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھولی، اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔ پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے "کپڑے اتار دو!"

"سارے؟"

"ہاں سارے!"

تارہ نے کپڑے اتار دیئے اور لیٹ گئی۔ جمیل نے اس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہوگا ــــ کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟



کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پیئے گی؟
کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی۔ نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے ــــ کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے ــــ خُم کے خُم لنڈھاتا پھرے۔

جمیل بہت خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مندنا شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا۔ تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خوابِ غفلت کے مزے لینے لگی۔

جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ــــ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ ایک الف ننگی لڑکی لیٹی ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف ننگا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے اُلٹا پاجامہ پہن
لیا، مگر اس کو اس کا احساس نہ ہوا۔ کرتہ پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔
نوٹ سب کے سب موجود تھے۔ اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر
پیا۔ پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا "اٹھو!"

تارہ آنکھیں ملتی اُٹھی۔ جمیل نے اس سے کہا "کپڑے پہن لو!"

تارہ نے کپڑے پہن لئے — باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں
کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا "اب کوچ کرنا چاہئے۔ لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا
چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں "کیوں تارہ
جب ہم لیٹے — میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے
اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟"

تارہ نے جواب دیا "کچھ نہیں — آپ نے اپنے کپڑے اتارے
اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے"

"بس؟"

"ہاں — لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے تھے اور
کہا میں گنہگار ہوں — میں گنہگار ہوں" یہ کہہ کر تارہ اُٹھی اور اپنے بال
سنوارنے لگی۔



جمیل بھی اُٹھا۔ گناہ کا احساس دبانے کے لئے اس نے ڈبل پیگ
اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی
طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا "چلے؟"

"ہاں، پھر کبھی آؤں گا" یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے
نیچے اتر گیا۔ بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اُٹھنے ہی والے تھے کہ
ہارن بجا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے کہا چلو
اچھا ہوا، یہیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا "کیوں بھائی خالی ہے؟"

ڈرائیور نے جواب دیا "خالی ہے کا کیا مطلب — لگی ہوئی ہے!"

"تو پھر......" یہ کہہ کر جمیل مڑا، لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا
"کدھر جاتا ہے سیٹھ؟"

جمیل نے جواب دیا "کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں"

ڈرائیور باہر نکل آیا "سیٹھ تمہیں بھول سے لا — یہ ٹیکسی تمہیں
نے تو لے رکھی ہے!"

جمیل بوکھلا گیا "میں نے!"

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا "ماں تیرنے ـــــ سالا
دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔"

اس پر تُو تُو میں میں شروع ہوئی۔ ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔
جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا "چلو!"

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی "کدھر؟"

جمیل نے کہا "پولیس اسٹیشن!"

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی ـــــ جمیل سوچ میں
پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اس نے لی تھی اس کا بل جو کہ اڑتیس روپے کا تھا اس نے
ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی۔ گو وہ نشے کی حالت
میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ
ڈرائیور، جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔
سب انسپکٹر جو کہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس
نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتاپا غلط تھی۔ جمیل یقیناً
اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر نے



مخاطب ہو کر اس نے کہا "جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا قصہ ہے
جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا۔
اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے"

ڈرائیور نے کہا "حضور انسپکٹر بہادر! یہ دارو پئے ہے" اور ثبوت
کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جمیل جھنجھلا گیا "ارے بھئی کون سؤر کہتا ہے کہ اس نے نہیں
پی ـــــ سوال یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے؟"

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ ڈرائیور کے حساب سے
بیالیس روپے بنتا تھا۔ اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور
بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے
نکلوا دیا۔ پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے۔
ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ
آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور
پوچھا "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے
کہا "مسٹر! اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے ـــــ یہ

کولابہ پولیس اسٹیشن ہے —— جاؤ اب گھر جا کر سو جاؤ "

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا —— برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوتی رہی ۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا ۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا ۔ سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے ۔ منہ کا ذائقہ خراب ۔ اس نے اٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پئے ، چار پانچ پیالے چائے کے ۔ کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گذشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا ۔

بہت لمبی زنجیر تھی ۔ ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں ، مگر بعض غائب ۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے کولابہ تک بالکل صاف تھا ۔ اس کے بعد جب نور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گڈمڈ ہو جاتا تھا ۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں ، بڑی واضح مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا ۔

وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا —— اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا —— اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی ۔



وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا ؟ —— یہ جاننا بہت اہم تھا ۔ اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں ۔ مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا ۔ اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا ، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی ؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا ۔ اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اس میں پڑے تھے سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چور چور ہو گئے ہیں ۔

رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پئے ، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گذشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا ۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا من و عن اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دور ہو —— اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا ۔ وہ سوچتا تھا یہ ادھورا گناہ جائے گا کس کھاتے میں ۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے ۔

مگر تلاشِ بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا — اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نذیر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس واقعے کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے۔ غالباً موتیوں کے سلسلے میں۔ جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اسے بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی — اس پر کچھ لکھا تھا — غالباً ڈاکٹر — ڈاکٹر پیرام جی — آگے جانے کیا —

ایک دن کراچی کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اسکو جانی پہچانی معلوم ہوئی — دو رویہ اسی قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار کسی پر پانچ — کسی پر تین۔



وہ ادھر اُدھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے۔ میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا، بتاؤ جی اس وقت — پھرنے دو مارا مارا — ایک دم اس نے اپنے دہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا — اس پر لکھا تھا — ڈاکٹر ایم پیرام جی — ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ — بالکل وہی — وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی اونچی سیڑھیاں۔ جمیل بے دھڑک اُوپر چلا گیا۔ اس کیلئے اب ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کوری ڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا — اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا "بیٹا، بائی جی ہیں؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا "جی ہاں!"

"جاؤ ان سے کہو صاحب ملنے آئے ہیں" جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی "نمستے!"

"نمستے، کہیے مزاج کیسے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا "اچھے ہیں ——— میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لئے آنہ سکا ——— کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟"

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "معاف کیجئے، میری شادی ہو چکی ہے"

جمیل بوکھلا گیا "شادی؟ ——— کب؟"

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا "جی، آج صبح ——— آیئے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں"

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر کوٹھا کھٹ کھٹ نیچے اتر گیا ——— سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ جمیل کا دل ایک لمحے کے لئے ساکت سا ہو گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا: "سیٹھ صاحب، ٹیکسی؟"

جمیل نے جھنجھلا کر کہا "——— نہیں کم بخت، شادی!"

# اللہ دتّا

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد البتہ لاہور کے تھے۔ مگر جب ان دو بھائیوں کا والد ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپراسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزرتی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھار کسی

غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ ہوشیاری سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ دوسری جس کا نام صغریٰ تھا تیرہ برس کی تھی اور پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی ——— زینب ——— اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لئے کہ اسکا خاوند اوباش تھا۔ پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، عفت اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ یکایک ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور



عزت آبرو پر حملہ ہوگا اور انہیں نہایت افراتفری اور کس مپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی ——— مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کونسا درخت گرا۔ کون سے درخت کی کون سی ٹہنی ٹوٹی ——— جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند تحقیقیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اسکی لڑکی زینب ——— کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کرکے بیٹھ رہے ——— پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے۔ پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے۔ آخر خدا نے اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا ——— بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل

بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اُٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالتِ زار الف سے لے کر یے تک کہہ سُنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پہ ملازم رکھ لیا۔ اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لئے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔

اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغریٰ بڑی سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی۔ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ اِدھر اُدھر سے لکڑیاں چُن کے لاتی۔ چولہا سُلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لئے پورا ہو جائے۔ آٹا گوندھتی۔ پاس ہی تنور تھا۔ وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔

صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ



اندر ہی اندر گھُلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی اُفتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ اُدھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لئے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اُٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سُلگا دیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے۔ وقت ملتا تو وہ دو تین گھڑے بھر کر گھڑونچی پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی — طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے جھوٹ نہیں کرتی تھی ——— اگر ممکن ہوتا
تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا نہیں — صرف
احترام کے لئے۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی تھی "یا پروردگار
——— میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔"
بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا،
وہی ہونا تھا۔ غریب صغریٰ کے سر پر غم واندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔
جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک
پر اللہ رکھا کو ایسی لُو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا، ہسپتال
پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔
صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے قریب
قریب اپنے آدھے بال نوچ ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔
مگر بے کار۔ کیسے ہوتا ——— وہ تو ایسی کشتی کے مانند تھی جس کا بادبان ہو
نہ کوئی پتوار اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہو۔"
پٹیالے کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی
تھی فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے
سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے



اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اسکا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے
اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس
کو دفنا آئیں۔
اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہر حال وہ
لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی
کو بہت دم دلاسا دیا۔ بہلایا۔ سینے کے ساتھ لگایا۔ پیار کیا۔ دنیا کی
بے ثباتی کا ذکر کیا۔ بہادر بننے کو کہا۔ مگر صغریٰ کے پھٹتے ہوئے دل پر
ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک
کرتی رہی۔
اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا "میں آپ کا بہت
شکر گذار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی۔
مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا
رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی ——— خدا آپ کو اس کا
اجر دے ——— اب میں اسے اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں میرے بھائی
کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔"
افسر صاحب نے کہا "ٹھیک ہے ——— لیکن تم ابھی اسے

کچھ دیر اور یہاں رہنے دو ـــــ طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا"

اللہ دتا نے کہا "حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلدی!"

افسر صاحب بہت خوش ہوئے "بڑا نیک ارادہ ہے ـــــ لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو اس کا اسی گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ تم شادی کا بندوبست کرو مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا"

بات درست تھی۔ اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا۔ زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اُداس ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی۔

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا "ارے بابا! آنا جانا کیا ہے ـــــ قبر پہ فاتحہ پڑھنی تھی۔ صغریٰ سے ملنا تھا اسے یہاں لانا تھا"

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی "صغریٰ کو یہاں لانا تھا" ایک دم چونک کر "ہاں ـــــ صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔ پر وہ کہاں ہے؟"

"وہیں ہے ـــــ پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں ان کے پاس ہے۔ انہوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لو گے



تو لے جانا" یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو؟ ـــــ کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟"

اللہ دتا نے زور کا کش لیا "ارے بھئی اپنا طفیل ـــــ میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے ـــــ میں اسے کیا غیروں کے حوالے کر دوں گا"

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری "تو صغریٰ کی شادی تم طفیل سے کرو گے؟"

اللہ دتا نے جواب دیا "ہاں ـــــ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا "ہاں ـــــ اور تم جانتے ہو کیوں ہے ـــــ یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی!"

اللہ دتا مسکرایا۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا منہ چوما "بچی ـــــ ہر بات پر شک کرتی ہے ـــــ اور باتوں کو چھوڑو، آخر میں تمہارا باپ ہوں"

زینب نے بڑے زور سے "ہونہہ" کی ۔ "باپ!" اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی۔

اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا۔

دن گذرتے گئے۔ طفیل خرما بزاز لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات کی تو وہ فوراً مان گیا۔ آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہو گئی —— اختر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لئے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لئے جو بالکل بے سہارا ہے، حسبِ توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انھوں نے مل ملا کر اس کے لئے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو گھیر رہے ہیں۔ بہر حال وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اسکا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کبھی نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اُترنے بھی نہیں پائی تھی کہ زینب نے اس سے گھر گرہستی کے کام لینے شروع کر دیئے۔ جھاڑو وہ دیتی۔ برتن وہ مانجھتی۔ چولھا وہ جھونکتی۔ بیلن وہی



یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی، لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتی ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے گی۔ کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھتکار دیا گیا تو اس کے لئے اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کام میں اسکا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا "صغریٰ تم بڑی پیاری ہو!"

صغریٰ جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پُرجوش پیار کی عادی نہیں تھی۔ اسکا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا "خدا

میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔"

صغریٰ طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کماتا تھا اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساتھ ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ سہم گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی۔ اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی۔ یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کی۔ اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی۔ ڈر کے مارے



اس سے کام نہ ہوتا، لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے، کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لئے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا "شور مت مچاؤ۔ یہ سب بے فائدہ ہے — چلو آؤ"

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر بھاگ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آگئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا "ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ" —— زینب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی — تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا "کیا بات ہے۔ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو"

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا — زینب آگ بگولا ہو گئی "کیا ایک کافی نہیں تھی — تمہیں پہلے تو شرم نہ آئی پر اب تو آنی چاہیے تھی — مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہوگا اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی — اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!"

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا "کیوں؟"

زینب نے کھلے طور پر کہا "میں اس گھر میں اپنی سوت دیکھنا نہیں چاہتی"

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی۔

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے — چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گذر گئے — صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے — آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

# بچنی

بھنگنوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خاص طور پر ان کی جو بٹوارے سے پہلے امرتسر میں رہتی تھیں۔ مجید کا یہ ایمان تھا کہ امرتسر کی بھنگنوں جیسی کراری چھوکریاں اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ خدا معلوم تقسیم کے بعد وہ کہاں تتر بتر ہو گئی تھیں۔

رشید ان کے مقابلے میں گجریوں کی تعریف کرتا تھا۔ اس نے مجید سے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو کہ امرتسری بھنگنیں اپنی جوانی کے زمانے میں بڑی پرکشش ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ جوانی کھترانیوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی — بس ایک دم جوان ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادھیڑ عمر ہو جاتی ہیں — ان کی جوانی معلوم نہیں کون سا چور چرا کے لے جاتا ہے

خدا کی قسم ——— ہمارے ہاں ایک بھنگن کوٹھا کمانے آتی تھی — اتنی
کڑیل جوان تھی کہ میں اپنی کمزور جوانی کو محسوس کر کے اس سے کبھی بات نہ کر
سکا ——— عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا۔
نام اسکا فاطمہ تھا۔ پہلے گھر والے اسے پھاتو کہتے تھے — مگر جب وہ
عیسائی ہوئی تو اسے مس پھاتو کے نام سے پکارا جانے لگا ——— صبح کو وہ
برک فاسٹ کرتی تھی، دوپہر کو لنچ اور شام کو ڈنر ——— لیکن چند مہینوں کے
بعد میں نے اسے دیکھا کہ اس کی ساری کڑیل جوانی جیسے پگھل گئی ہے —
اس کی چھاتیاں جو بڑی تُندخو تھیں اور اس طرح اوپر اٹھی رہتی تھیں جیسے ابھی
اپنا سارا جوبن آپ بدماغ دیں گی، اس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا
نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا ——— لیکن اس کے مقابلے میں ہمارے گھر
میں وہ گجری جو اوپلے لے کر آتی تھی تیر کی طرح سیدھی تھی۔ اس کی عمر بھی
اتنی ہی ہوگی جتنی اس بھنگن کی تھی ——— مگر وہ تین برس کے بعد بھی ویسی
ہی جوان تھی ——— سرو قد ——— اوپلوں کا ٹوکرا اس کے سر پہ ہوتا تھا۔
ایک پہاڑ سا بنا ہوا، مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش آجائے
یا اس کی کمر میں خفیف سا خم آجائے ——— تین برس وہ ہمارے یہاں آتی
رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی ——— اس کے کچھ عرصے بعد



تین لڑکے پیدا ہوئے ——— اور مجید میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کی
کمر ویسی کی ویسی مضبوط تھی ——— تم میری مان لو کہ بھنگنیں گجریوں کا مقابلہ کسی
صورت بھی نہیں کر سکتیں۔"

مجید تلملا رہا تھا۔ اس نے پان کی گلوری پنڈیا سے نکال کر اپنے کلے
میں دبائی۔ چھوٹی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ
میں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا "رشید بھائی ——— تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن
جس بھنگن کا نقشہ میرے دماغ میں ہے اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا
تھا ——— اس کی گرد کو امرتسر کی کوئی گجری نہیں پہنچ سکتی ——— وہ ایک قیامت
تھی ——— ایک فتنہ تھا ——— اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سن لو تاکہ
تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے ——— جوبن ڈھلنے کی
تم جو بات کرتے ہو اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ گجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے
قدرتی طور پر انہیں جلدی ڈھلنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ننگے
پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پر بقول تمہارے پہاڑ سا اوپلوں کا ٹوکرا اٹھائے
اٹھائے پھرتی ہیں ——— لیکن لعنت بھیجو فی الحال گجریوں پر کیونکہ مجھے
بھنگن کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کلاڑی بھنگن تھی ——— اس کا قد
تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گز تھی۔ شادی شدہ تھی، مگر خاوند سے

ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا اور کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اُٹھائے پھرتے تھے۔"

رشید نے مجید سے کہا "یہ جھولے کی بات کہاں سے آ گئی — تم تو ایک کراری بھنگن کی بات کر رہے تھے —— جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی"

مجید نے فوراً کہا "یار تم جھولے کے ساتھ کیوں اٹک گئے — میری پوری کہانی تو سن لو — یہ جھولے کی نہیں بھنگن کی ہے — اس بھنگن کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا —— وہ ایک آفت تھی — صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی —— ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لئے — ماتھے پر سینکڑوں تیوریاں —— ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پہ دے مارے گی — مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا —— میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پہ جھاڑو نہیں ماری —— اس کی تیوریاں اس کے ماتھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی



رہی — اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اوّل درجے کا زن مرید تھا اس کا قد اپنی بیوی سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ اس کو کام کے دوران میں چٹکیاں دیا کرتی تھی —— محلے کے سب لوگ ہنستے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے تھے۔"

رشید اتنی لمبی داستان سن کر بھنا گیا "تم اصل بات کی طرف آؤ — یہ کیا شہد سے گڑیاں بک رہے ہو — بھنگی نام بڑا اچھا ہے، ورنہ خدا کی قسم میں تمہاری یہ خرافات کبھی نہ سنتا —— معلوم نہیں، یہ تمہاری جوڑی ہوئی کہانی ہے — بہرحال تمہیں چند منٹ دیتا ہوں — سناؤ"

مجید تاؤ میں آ گیا "اُلّو کے پٹھے —— تم نے صرف بھنگی کا نام سنا ہے، کبھی تم نے اسے دیکھا ہوتا تو دل نکال کر اس کے ٹوکرے میں ڈال دیا ہوتا — میں تم سے اگر ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس میں نمک مرچ لگانے کی مجھے اجازت ہونی چاہیئے — تم اگر اکتا گئے ہو تو جہنم میں جاؤ"

رشید کو اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی سینما میں چلا جاتا۔ اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ مجید کی داستان سن لے "جہنم میں جانے کا سوال نہیں — تم ذرا اختصار سے کام لو... اصل میں مجھے بھنگن سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے"

مجید غصے میں آ گیا "تمہاری دلچسپی کی ایسی کی تیسی ــــ سالے، تم
کون ہوتے ہو اس میں دلچسپی لینے والے ــــ اس میں دلچسپی لینے والے
تم ایسے ہزاروں تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی ــــ میں تم سے
کروڑ مرتبہ زیادہ خوبصورت ہوں، لیکن میں اس کی نگاہِ التفات کا ہر وقت
منتظر رہتا تھا ــــ وہ بڑی ہٹیلی تھی ــــ میرے دوست رشید! خدا
کی قسم، اس جیسی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ نام اس کا پچی تھا
ــــ لیکن بچن سے تعلق رکھتا تھا ــــ مگر وہ تو بلا کی کٹنی تھی ــــ میں نے
بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پر ناکام رہا۔ وہ مجھے
پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی"

یہ سن کر، رشید بولا "تم یار ہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو"
مجید کے گہری چوٹ لگی "تم کیا اس کرتے ہو ــــ میں نے ایک روز
اسے پکڑ لیا ــــ میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے
اسکا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا"

"پھر کیا ہوا؟" رشید نے ازراہِ مذاق سگریٹ سلگایا اور ماچس کی
تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔
مجید کو ایسا محسوس ہوا کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں!



بہت بچھڑ رہا، لیکن آدمی سچا تھا اس لئے جھوٹ نہ بول سکا "یار رشید!
تم مذاق اڑاتے ہو ــــ لیکن واقع یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا حق
اُلٹا ہی چاہئے ــــ میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا ــــ لیکن اس
حرامزادی نے کھینچ کے اپنی جھاڑو میرے منہ پر دے ماری۔ میں شرم کے
مارے اندر بھاگ گیا ــــ لیکن فوراً باہر نکلا ــــ دیکھا کہ وہ میرے مکان کے
باہر جھاڑو دے رہی ہے ــــ میں نے اسے پھر پکڑا ــــ اس نے
کوئی مزاحمت نہ کی ــــ میں نے سوچا ــــ"

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا "کہ معاملہ درست ہو گیا ہے"
مجید بوکھلا گیا "خاک درست ہوا ــــ وہ میری گرفت سے نکل کر
سیدھی میری بیوی کے پاس چلی گئی ــــ لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔
میں ڈر کے مارے دبکا ہوا تھا ــــ میں نے صرف یہ سنا، اور میری جان کا
بوجھ ہلکا ہوا ــــ "بی بی جی، آج بھی پانی نہیں آیا ــــ یہ ان لوگوں کو جو آپ
سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے ــــ کیوں وہ اتنا
خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک
کے حساب سے دو روپے آٹھ آنے دینا پڑیں ــــ" میں نے خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرو رکھ لی ــــ لیکن میں نے بعد میں

سوچا کہ میری عزت آبرو رکھنے والی اصل میں بچی ہے — لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا گناہ ہے۔"

رشید قریب قریب تنگ آ چکا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا "کافر کے بچے — بات ختم کر، یہ کہ تیرا اس بچی کی وجہ سے کیا بنا؟ — کیا تم نے اسے پا لیا؟"

مجید نے رشید کی پنڈلیا پہ ایک گھوری لی اور کہا "دیکھو رشید — تم بچی کو جانتے نہیں — افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اسکا کردار بہت اچھی طرح — جیتا جاگتا پیش کر سکتا — وہ معلوم نہیں ہے کیا تھی — عمر اس کی زیادہ سے زیادہ — یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہوگی — قد اسکا ساڑھے چار فٹ ہوگا — چھاتی ایسی تھی جیسے لیے کی بنی ہے۔ حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی!"

رشید بہت تنگ آ گیا "ایک بچے کی ماں کے بچے — تو اپنی داستان کے انجام کو پہنچ — مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے — ساڑھے سات بج چکے ہیں لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی"

مجید سنجیدہ رہا "رشید لالے — معاملہ بڑا نازک ہے"



"کس کا؟ — تمہارا یا میرا؟"

"میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت معاملہ میرا، تو بہت نازک تھا — مجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں کیا نہ کروں — اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کا مالک تھا — تم جانتے ہی ہو کہ ماں باپ مر کھپ چکے تھے — ساری جائداد کا میں وارث تھا جہاں چاہتا لگا دیتا — اس روز جب میں نے بچی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہٹی جیسے میرا کام تمام کر دے گی لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا"

رشید نے اس سے پوچھا "تجھے کامیابی ہوئی؟"

"خاک — تو اسے جانتے ہی نہیں ہو — بڑی تیز طرار لڑکی ہے — اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی — لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیڑ چھاڑ کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر وہ چاہتی تو میرا گھر نکالا کر سکتی تھی"

رشید مسکرایا "میں تمہاری بچی کو جانتا ہوں!"

مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا "تم کیسے جانتے ہو اس کو؟"

"جس طرح تم جانتے ہو ـــــ کیا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے میں کام کیا کرے ـــــ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں"

مجید کو یقین نہ آیا "بکواس کرتے ہو ـــــ اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو ـــــ دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں بلاناغہ آتی ہے۔ اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہوگی ـــــ یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا ـــ لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔

رشید پھر مسکرایا "تمہارا!"

"میرا!" مجید گھبرا گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا "میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے ـــــ کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں"

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی "تمہیں اپنی بھنگن کے شوہر کا نام معلوم نہیں!"

"نہیں!"

"میں بتاتا ہوں تمہیں ـــــ اس کے شوہر کا نام رشید ہے"



مجید بوکھلا گیا "رشید! ـــ کیا اس کا نام رشید ہے!"

رشید نے بڑے ذوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "ہاں ـــ اس کا نام رشید ہے ـــــ اصل میں وہی اس کا شوہر ہے"

"وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا جھلاتا ہے؟" مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی۔

رشید کی سنجیدگی میں کچھ اضافہ ہو گیا "وہ اُلّو کا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا"

"تو کسے جھلاتا ہے ـــ کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟"

"نہیں!"

"تو کس کا بچہ ہے!"

"ایک بہت غریب اور نادار آدمی کا ـــ جو خوبصورت بھی نہیں ـــ تم سے ہزاروں درجے نیچے ہے"

"کون ہے وہ"

"پوچھ کے کیا کرو گے!"

"کروں گا کیا ـــــ بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں"

رشید نے ایک سگرٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے کہا "جان

چاہتے ہو تو جان لو ——— وہ رشید میں ہوں ——— تمہاری بچی سے میری
آشنائی بچپن کی ہے ——— وہ گیارہ برس کی تھی ——— میں تیرہ برس کا۔
جب سے میرا اس کا معاملہ چلا آ رہا ہے ——— وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں
دیکھتے ہو اور جسے اس کا اکڑ کا پٹھا شوہر ہر روز جھلا جھلاتا ہے، اس خاکسار
کی اولاد ہے ——— شکر ہے خداوند کریم کا کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں اسے
دوسرے ہی روز مار ڈالتا۔

یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا ——— مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم
نے اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا۔

# سرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے
اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جہاں
کہانی سے متعلق ہے پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب، اور جہاں
وہ عورت رہتی تھی اس کا گھر جھونپڑا نما تھا ——— سرکنڈوں کے پیچھے!
گھنی باڑ سی تھی جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا، کچی مٹی کا بنا ہوا،
چونکہ یہ باڑ سڑک سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا
تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔
سرکنڈے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے

گئے کہ ایک دبیز پردہ بن گئے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیدا کئے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پردہ پوش تھے۔

مکان کہیے، یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھڑیاں تھیں، مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا۔ پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا۔ اس کے ساتھ ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیا رات بھر جلتا رہتا تھا ـــــ مگر یہ طاقچہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتا دوں جو اس مختصر سے مکان میں جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا رہتا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ۔ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی ایک یتیم لڑکی تھی جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی ـــ حقیقت جو کچھ بھی ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجیے گا۔

دیکھیے میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا ـــ بات اصل میں



یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے سکینہ، پروین، گلشن یا کوئی اور ـــ آخر نام میں کیا رکھا ہے۔ لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی، اس کے سرخ و سفید گالوں پر گو کسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بیٹی (معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں) شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ وہ فاحشہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔ اصل میں اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پرورش پائی تھی کہ اسے صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر ـــــ اس نواڑی پلنگ پر متعارف کرایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے مانوس ہو گئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے

پاس آسکتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نواڑی پلنگ پر لیٹتے تھے۔ اس
نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔

یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی۔ ان معنوں میں جن میں
ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں، مگر سچ پوچھئے تو اس کو
اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے — وہ اس کے
متعلق غور بھی کیسے کر سکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس پہنچتے ڈیڑھ
ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی اس لئے
کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ اور وہ اس مرد کی ہر آسائش اس
کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی تھوڑی سی تکلیف بھی برداشت نہیں
کر سکتی تھی۔

اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی
تھی کہ جو مرد اس کے پاس موٹروں میں آتے ہیں صبح سویرے اپنے دانت
برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے
بستر ہی میں چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں پھر رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں
مگر اس نے آہستہ آہستہ شہر سے آنے والے ان مردوں کی عادات سے



کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک جیسے
کے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی صبح سویرے اٹھ کر سگرٹ مانگتا تھا، کوئی چائے
اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات
جاگتے رہتے اور صبح موٹروں میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا
کہ وہ اپنے گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لئے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر
کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی — مثال کے
طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث ایکدم
خراب ہو جائے، تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے
دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ ایک آدھ گلاس گرم گرم پانی
پلا کے تے کرا دے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔

سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جونہی کوئی گاہک آتا وہ اس سے
نواب کی فیس پہلے ہی وصول کر کے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے
مخصوص انداز میں دعائیں دے کر کہ "تم آرام سے جھنڈے گاڑو" افیم کی ایک
گولی ڈبیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔

جو روپیہ آتا اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے

وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولتمند ہوتے، اس لئے وہ اچھا سے اچھا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی ——— سچ سے پوچھئے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ، اور خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھی ——— ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لا دئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا۔ مگر شاید وہ اس سے بے خبر تھی ——— سچ پوچھئے تو اس کو کسی بات کی بھی خبر نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔

سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ معلوم تھا اس کے کہ ایک پکی سڑک ہے، جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر دھول اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ہارن بجتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی۔ کھٹیا پر سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر



موٹر والے سے کہتی ہے کہ موٹر ذرا دور کھڑی کر کے اندر آ جائے۔ اور وہ اندر آ جاتا ہے اور نواڑی پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہوشیار عورت تھی ——— وہ ہر گاہک کے لئے خاص دن مقرر کر دیتی اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے وقت وہ اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی اور جب اس کا ماں بن جانا یقینی تھا۔ مگر سردار دو ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدرتی خطرے سے نپٹ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے پر چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار تھی اور اس کی بیٹی نواب! یا کوئی بھی وہ تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے ایک دن مٹی کے اس مکان میں ایک انقلاب
پیدا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غالباً جیپ تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔
سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات
نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دور کھڑی کر کے وہ اترا اور سیدھا
ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہے۔

سردار بہت پٹپٹائی، لیکن دروازہ کی دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی
پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں
نواڑی پلنگ تھا۔ وہ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آ گئی۔۔۔
ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی
ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے۔ اس لئے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو کر
سلام کیا اور پوچھا "آپ کو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟"

اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں
میں اپنی انگلی چبھو کر کہا "اس نے۔"

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا "ہائیں
۔۔۔ میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں۔"

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی "ہم تو کئی بار



تم سے مل چکے ہیں۔"

نواب نے پوچھا "کہاں ۔۔۔ کب؟" حیرت کے عالم میں اس کا
چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا
موجب ہو گیا۔

اجنبی نے اس کا گدگدا ہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں ۔۔۔ اپنی ماں سے پوچھو۔"

نواب نے بڑے بھولے پن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس
سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں
آتے ہیں ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہوگا اور سارا
۔۔۔ پتا بتا دیا ہوگا۔ چنانچہ اس نے نواب سے کہا "میں بتا دوں گی تمہیں۔"

اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھٹیا پہ بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم
کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے۔ گڑبڑ نہیں کرے گا۔
وثوق سے اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا، لیکن اغلب یہی ہے
کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب
کے الھڑ پن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار
سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔

اس نے ہیبت خان سے کہا: "خان صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے — کیا آپ آٹا روپیہ دے سکیں گے کہ ........"

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سرکنڈوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس وہ دیر تک اپنی اسی انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چونکی اور سرکنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ بھی نہیں تھا۔

سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انہیں گن چکی تھی۔ ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوار کے نیفے میں بڑی صفائی سے اڑسے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔



نواب بہت خوش تھی۔ وہ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس میں ہیرے کی انگوٹھی پڑی تھی — تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے۔ اس لئے اس نے یہ دھندا بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا بے نیل مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینک کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخا دے گی کہ پولیس والے اس کے پیچھے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔

وہ اسی شان سے آیا جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ سردار سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے — بلکہ یوں کہئے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں نواب کا پلنگ تھا۔ اب کی سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اونگھتی رہی۔

ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الھڑپن اور بھی زیادہ پسند
آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھریلو پن
بھی نہیں تھا جو عام گھریلو عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو
خود اس کی اپنی تھی۔ دوسروں سے بالکل مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ
اس طرح لیٹتی تھی جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر
ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال
نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہیبت خان کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لئے عورت کی
یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دو بار آنے
لگا تھا۔ نواب، اس کے لئے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔

سردار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑسنے کے لئے کافی نوٹ مل
جاتے ہیں ــــ لیکن نواب اپنے الھڑپن کے باوجود بعض اوقات سوچتی
تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔ اگر کبھی سڑک پر سے سرکنڈوں کے
اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم جاتا ہے۔ کیوں اس سے
الگ ہو کر باہر جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری۔ ہیبت خان



اور نواب دونوں ایک دوسرے سے لگتے ہوئے سو رہے تھے کہ ایکدم
ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند ٹوٹ چکی تھی
وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آ گیا ہے۔
چیخ کر اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر
اس سے کہا "کوئی بات نہیں ــــ میں ــــ میں شاید خواب میں ڈر
گیا تھا۔"

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آ رہی تھی۔

نواب نے اس سے کہا "نہیں خان ــــ کوئی اور بات ہے۔
جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے تمہاری یہی حالت ہوتی
ہے۔"

ہیبت خان کی شاید یہ دکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔
اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لئے بڑے تیز لہجے میں کہا "بکتی ہو تم
ــــ موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کے
ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ ہیبت خان نے

جب اس کو چپ کرایا تو وہ اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین حظ سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب کے جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

ہیبت خان اچھے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا خوبصورت تھا۔ اس کی بانہوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی! اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہئے کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر ڈھیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ ہیبت خان موٹروں اور لاریوں کی آمد و رفت سے کیوں گھبراتا ہے۔

مہینوں گزر گئے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے التفات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہیبت خان چند گھنٹوں کے لئے آتا اور نا آسودگی کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر سکتی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہیبت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا، مگر وہ گول کر گیا۔



ایک دن صبح سویرے اس کی ڈیوڑھی کے سرکنڈوں سے کھڑ کھڑ ہوئی۔ نواب سو رہی تھی۔ ایسا بجا تو چونک کر اٹھی۔ آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔ اس وقت ہیبت خان اپنی موٹر دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر اس کمرے میں لے گیا جہاں نواب کا پلنگ تھا۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں ——— معلوم نہیں نواب کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی۔ خان ——— مجھے سونے کے کڑے لا دو؟

ہیبت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری گوری گوری سفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا۔ "کل ہی آ جائیں گے۔ تمہارے لئے تو میری جان حاضر ہے۔"

نواب نے ایک ادا کے ساتھ مگر اپنے مخصوص الھڑ انداز میں کہا۔ "خان صاحب ——— جانے دیجئے ——— جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔"

ہیبت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا ——— اور بڑا پرلطف وقت گزار کے چلا گیا اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنائے گا۔

زاب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک مسرت بھرے ریکارڈ بجا بجا کر
اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ناچتی رہی جس میں نواڑی پلنگ تھا ــــ سردار بھی
خوش تھی۔ اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی
اور اسے نگل کر سو گئی۔

دوسرے دن زاب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے
والے ہیں اور ہیبت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی
پر وہ نہ آیا۔ اس نے سوچا، شاید موٹر خراب ہو گئی ہو ــــ شاید رات ہی
کو آجائے۔ مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہیبت خان نہ آیا۔ اس کے دل
کو جو بہت نازک تھا بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ
تھی، بار بار کہا: "دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے۔" لیکن پھر
وہ سوچتی اور کہتی "یہ ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو؟" اور وہ سہم سی جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری،
کسی ڈاکو کا حملہ ــــ لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا
خیال آتا تھا۔ جن کو سُن کر ہیبت خان ہمیشہ کھلا جاتا تھا ــــ وہ اس کے
متعلق پہروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا۔



اس لئے کہ سرداراں سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ
اس کچی سڑک پر سے حسبِ اتفاق گذریں۔ زاب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی
ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا
کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہیبت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں
مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں اور اپنی کم عقلی
پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہیبت خان جیسا تنومند مرد
ان کی آواز سُن کر سہم کیوں جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی
ہوئی کوئی دلیل جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم
ہو جاتی اور گراموفون پر وہ پہلے ریکارڈ لگا کر سُننا شروع کر دیتی اور اس کی
آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب زاب اور سردار کھانا کھا کر فارغ
ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے
موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ دونوں یہ آواز سُن کر چونکیں۔ کیونکہ یہ
ہیبت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی ــــ سردار باہر لپکی کہ دیکھے
کون ہے۔ پرانا آدمی ہو تو اسے ٹرخا دے۔ مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس

پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں ہیبت خان بیٹھا ہے۔ پچھلی نشست
پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔

ہیبت خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی
پچھلی نشست سے وہ عورت ——— دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے
سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ عورت کے لئے تو ہیبت خان اتنی
دور سے چل کر یہاں آتا ہے، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے جو ان
بے قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہیبت خان اس خوبصورت عورت کے
ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان میں داخل ہو گیا۔
وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان
ہی نہیں دیا تھا۔

جب وہ اندر گئی تو ہیبت خان، نواب اور وہ عورت تینوں نواڑی
پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی ——— عجیب قسم کی خاموشی زیوروں
سے لدی پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک
ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔

سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر



جب ہیبت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا۔ ہیبت خان
نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

اس عورت کی ٹانگ کا ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی "ہم آئے
ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔"

سردار نے سر تاپا مہمان نواز بن کر کہا "جو تم کہو ابھی تیار ہو جاتا ہے۔"
اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے
کی عورت ہے سردار سے کہا "تو چلو تم باورچی خانے میں ——— چولہا سلگاؤ
——— بڑی دیگچی ہے گھر میں؟"

"ہے!" سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔
"تو جاؤ اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔" وہ عورت پلنگ پر سے
اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا "گوشت وغیرہ تو
یہاں نہیں ملے گا؟"

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی "یہ مل جائے گا۔ تم سے جو کہا
ہے وہ کرو ——— اور دیکھو آگ کافی ہو۔"
سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے

مخاطب ہوئی "نواب! ہم تمہارے لیے سونے کے کڑے لے آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا وضع دار بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سُرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب، اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "خان، یہ کون ہے؟"

اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی "میں کون ہوں؟ — میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جیسے کہ اس جواب پر سکڑ سا گیا تھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی "میرا نام ہلاکت ہے۔"

نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ ان میں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور اس نے سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی نواب کی کلائیاں پکڑیں اور ان میں کڑے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان



سے مخاطب ہوئی "تم جاؤ ہیبت خان — میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔"

ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتایا تھا، ذرا تیزی سے بولی "جاؤ — تم نے سنا نہیں؟"

ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ سا تھا اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا باورچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلگا چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا — اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔

جب اس کو دور سے ایک لاری آتی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اُڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مُردہ تھا — اس نے جا کر سرکنڈوں

کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں خواب کے
عالم میں گزاری تھیں مگر وہ نہ جا سکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک بھی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت
جو اس کے ساتھ آئی تھی، اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے۔ صرف
اس بنا پر کہ بہت دیر ہوئی وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو
اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پرسی ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو
گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا۔ اور اس عورت
نے اس کو اپنے بنگلے میں اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا
نوکر ہے۔

ہیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے
اس سے اپنے عجیب و غریب بنگلے میں بڑے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لئے
یہی بہت بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ
دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی مگر اسے اس دولت سے
کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی
کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے بنگلے کے نیچے شاید اس لئے دب کے
رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی تھا



بہت دیر تک وہ بھی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور بنگلے
کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے
میں سردار کو کچھ بھونتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا
پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ پکے فرش پر اس کو سب سے پہلے
خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازے کے
پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا "میں نے تمہاری نواڑ
کو سجا بنا دیا ہے؟"

ہیبت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی قدر تر کر کے اس
سے پوچھا "کہاں ہے؟"

شاہینہ نے جواب دیا "کچھ تو اس پلنگ پر ہے ——— لیکن اس کا
بہترین حصہ باورچی خانے میں ہے۔"

ہیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ کہہ
نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور ...... اور ایک تیز چھری بھی پڑی ہے اور نواڑی پلنگ
پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلودہ چادر پڑی ہے۔

شاہینہ نے مسکرا کر کہا "یہ چادر اٹھا کر دکھاؤں ——— تمہارا مخبر یہی نواب
تھا ——— میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگسار کیا ہے ——— لیکن تم پہلے کھانا کھا
لو۔ بہت بھوک لگی ہوگی تمہیں۔ سوار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں
میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں"۔

ہیبت خان کے پاؤں اکھڑ گئے ——— زور سے چلایا "شاہینہ تم نے
یہ کیا کیا؟"

شاہینہ مسکرائی "یہ جان من یہ پہلی مرتبہ نہیں ——— دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند
اللہ اسے جنت نصیب کرے' تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو
اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا
——— تم سے مجھے پیار ہے' اس لئے میں نے تمہارے بجائے......"

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلودہ چادر ہٹا دی ———
ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی پھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کا جلاد ہے اور وہ
قید خانے میں ہے۔

# وہ لڑکی

ساڑھے چار بج چکے تھے۔ لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو دوپہر کو بارہ
بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکنی میں آ کر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر
آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لئے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں
میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اتنا سانولا کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک
حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس
کی قربت چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ
کر سکتا تھا۔

موسم بہت واہیات قسم کا تھا۔ گرمی تھی۔ ساڑھے چار بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چھوٹا جا رہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے سے آتا پانی نکل رہا تھا۔

سریندر نے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہوگا، مگر پسینہ بلامبالغہ چار گلاس نکلا ہوگا۔ آخر یہ کہاں سے آیا؟

جب اس نے اس لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے جسے دھوپ کی پروا ہے نہ موسم کی۔

سریندر پسینے میں لت پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بہت بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے بدن پر کسی نے موبل آئل مل دیا ہے، لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ گھل مل جائے۔ اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔



آسمان خاکستری تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل ہیں یا محض گرد و غبار۔ بہرحال اس گرد و غبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی سستا رہی تھی۔

سریندر نے ایک غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ مگر نقش بہت تیکھے تھے۔ اس قدر تیکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چبھے۔

مزدور پیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو، لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اسے اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔

گھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بہن مری میں تھی۔ ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ایک بھائی تھا، اس سے چھوٹا، وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔ سریندر کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس سے قبل وہ اپنی دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑا چکا تھا۔

معلوم نہیں کیوں، لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے۔

اسے اوپر ہی سے اشارہ کرے تاکہ وہ اس کے پاس آجائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطے لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔

سریندر نے بالکنی کے کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھنکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔ سریندر نے جب کئی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی "ارے بھئی ——— ذرا ادھر دیکھو۔"

مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اپنی پنڈلی کھجلاتی رہی۔

سریندر کو بہت الجھن ہوئی۔ اگر لڑکی کے بجائے کوئی کتا ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔ اگر اسے اس کی یہ آواز ناپسند ہوتی تو بھونکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ اگر سنی تھی تو ان سنی کر دی تھی۔

سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا "اے لڑکی!"

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ جھنجھلا کر اس نے اپنا ململ کا کرتہ پہنا اور نیچے اترا۔ جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اسی طرح اپنی ننگی پنڈلی کھجلا رہی تھی۔



سریندر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی پنڈلی ڈھانپ لی۔

سریندر نے اس سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی نے جواب دیا "بیٹھی ہوں۔"

"کیوں بیٹھی ہو؟"

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی "لو اب کھڑی ہو گئی ہوں۔"

سریندر بوکھلا گیا "اس سے کیا ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟"

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنولا گیا "تم چاہتے کیا ہو؟"

سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹٹولا "میں کیا چاہتا ہوں ——— میں کچھ نہیں چاہتا ——— میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

لڑکی کے گدرے سانولے ہونٹوں پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی "مہربانی ——— کاہے کی مہربانی ——— چلو!"

اور دونوں چل دیے۔

جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوفے کے بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی

کھجلانے لگی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس میں وہ تمام قوسیں اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کا مضبوط جسم اس کے باہر جھانک رہا تھا۔

سریندر نے اس سے کہا "یہاں کیوں بیٹھی ہو ——— ادھر صوفے پہ بیٹھ جاؤ؟"

لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا "نہیں!"

سریندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا "تمہاری مرضی ——— لو اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور درخت کے نیچے تم آتی ویسے کیوں بیٹھی تھیں؟"

"میں کون ہوں اور درخت کے نیچے میں کیوں بیٹھی تھی ——— اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔" لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پائنچہ نیچے کر لیا اور پنڈلی کھجلانا بند کر دی۔

سریندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے اس کا دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں۔



جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکلیں۔ لیکن اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کسا ہوا تھا۔

سریندر نے ان ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے اپنی طرف سے کبھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھڑیوں میں لے جاتی تھیں۔ مگر سریندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کو اب خود کرنا پڑے گا، حالانکہ وہ اس کی تکنیک سے قطعاً ناواقف تھا۔ بہرحال اس نے اپنا ایک بازو تیار کیا اور اسے لڑکی کی کمر میں حائل کر دیا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا "یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

سریندر ایک بار پھر بوکھلا گیا "میں ..... میں ..... کچھ بھی نہیں۔"

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی "آرام سے بیٹھے رہو۔"

سریندر آرام سے بیٹھ گیا۔ مگر اس کے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر سریندر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ فرش پر چت گر پڑی۔ سریندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑا دھڑ اس کے گہرے سانولے ہونٹ چومنے شروع کر دئیے۔

لڑکی بے بس تھی۔ سریندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ بہ درجۂ مجبوری وہ اس کے ڈھل گیلے بوسے برداشت کرتی رہی۔

سریندر نے یہ سمجھا کہ وہ رام ہو گئی ہے، چنانچہ اس نے مزید دراندستی شروع کی۔ اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کر دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔

سریندر کو اب یقین ہو گیا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہے گا۔ چنانچہ اس نے دراز دستی چھوڑ دی اور اس سے کہا "چلو آؤ، پلنگ پر لیٹتے ہیں؟"

لڑکی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی، دونوں پلنگ پر لیٹ گئے۔

ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سریندر سے پوچھا "میں کھا لوں؟"

"ہاں ہاں — ایک نہیں سب کھاؤ۔"

سریندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا، مگر لڑکی نے اس سے دونوں چیزیں لے لیں۔

"میں خود چھیلوں گی۔"

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے بچا کر



پر سے سفید سفید جھلی ہٹائی۔ پھر پھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک پھانک سریندر کو دی، دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا "تمہارے پاس پستول ہے؟"

سریندر نے جواب دیا "ہاں — تمہیں کیا کرنا ہے؟"

لڑکی کے گدرے سانولے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے ایسے ہی پوچھا تھا — تم جانتے ہو نا کہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں؟"

سریندر نے دوسرا مالٹا طشتری میں سے اٹھایا "آج سے ہو رہے ہیں — بہت دنوں سے ہو رہے ہیں — میں اپنے پستول سے چار مسلمان مار چکا ہوں — بڑے خونی قسم کے۔"

"سچ؟" یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی "مجھے ذرا وہ پستول تو دکھانا۔"

سریندر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا "یہ لو — لیکن ٹھہرو" اور اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ٹھیک کر دیا۔ کیونکہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔

لڑکی نے پستول پکڑا اور سریندر سے کہا "میں بھی آج ایک مسلمان ماروں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے سیفٹی کیچ کو ایک طرف کیا اور سریندر پر پستول داغ دیا —

وہ فرش پر گر پڑا اور جاں کنی کی حالت میں کراہنے لگا: یہ تم نے کیا کیا؟"

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی: "وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے، ان میں میرا باپ بھی تھا۔"

# محمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی —— غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں —— یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔

مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا —— محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہ ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی، یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا تھا مگر محمودہ کی آنکھیں، اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ مخملیں پردے کے مانند حائل ہو گئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چہچہا رہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں پر چھیڑ خانی ہو رہی تھی، مگر وہ الگ، تھلگ کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت سجتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے، چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ بھرا بھرا جسم، تیکھی ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹا سا لب دہان ——— اور آنکھیں ——— جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھیں۔

مستقیم اپنی دلہن گھر لے آیا۔ دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا اس لیے کہ اس کی بیوی خوبصورت اور باسلیقہ تھی ——— لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہو گئی ہیں۔

مستقیم کو محمودہ کا نام معلوم نہیں تھا ——— ایک دن اس نے اپنی بیوی



کلثوم سے برسبیل تذکرہ پوچھا: "وہ ——— وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر ——— جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی، وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی؟"

کلثوم نے جواب دیا: "میں کیا کہہ سکتی ہوں ——— اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟"

مستقیم نے کہا: "وہ ——— وہ جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں؟"

کلثوم سمجھ گئی: "اوہ ——— آپ کا مطلب محمودہ سے ہے ——— ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں ——— غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گو اور شریف ——— کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔"

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا: "اس کی شادی ہو گئی کل؟"

"ہاں ——— میں کل وہیں تو گئی تھی ——— میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے؟"

"ہاں ہاں ——— مجھے یاد آ گیا ——— لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو، وہی لڑکی ہے، بڑی بڑی آنکھوں والی ——— کہاں شادی ہوئی ہے اس کی؟"

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا: "اپنے عزیزوں میں

— خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے — سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے۔"

مستقیم نے گلوری کلّے کے نیچے دبائی۔ "چلو اچھا ہو گیا — لڑکی بھی جیسا کہ تم کہتی ہو شریف ہے۔"

کلثوم سے نہ رہا گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ "حیرت ہے کہ آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔"

مستقیم نے کہا۔ "اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہیں کہ آدمی انہیں بھول نہیں سکتا — کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

کلثوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی۔ "میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی — مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں؟"

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ جواب میں مسکرا کر وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا — اتوار کی چھٹی تھی حسبِ معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے جانا چاہیے تھا مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔



اس نے آرام کرسی پر لیٹ کر تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا۔ مگر حروف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا۔ "شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی — ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے — ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے — پر کیوں؟

— میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا — میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لئے پُرکشش بن جائیں — ایک لمحے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے، نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انہیں دیکھا۔"

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ "تو ہو گئی اس کی شادی — چلو اچھا ہوا — لیکن دوست یہ کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے — کیا تم چاہتے ہو کہ اس کی شادی نہ ہو سدا کنواری رہے، کیونکہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی، تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا، پھر یہ جلن کیسی ہے؟ — اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا کبھی خیال نہ آیا، پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو — بفرضِ محال دیکھ بھی لو تو کیا کرو گے

اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لوگے ——— اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر
اپنے بٹوے میں ڈال لوگے ——— بولنا، کیا کروگے؟"

مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی
نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔

محمودہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے یعنی اس وقت
جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں
یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لجائی بیٹھی تھی ——— وہ خود شریف تھی
اس کا شوہر بھی شریف تھا، ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سو روپیہ
ماہوار تنخواہ پاتا تھا ——— بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش
رہے ——— ساری عمر خوش رہے ——— لیکن اس کے دل میں جانے کیوں،
ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے
متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہئے ——— دو برس گذر گئے۔ اس دوران میں اسے
محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوئی کوشش کی۔ حالانکہ
وہ اور اس کا خاوند بمبئی میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم گو ڈونگری
سے بہت دور ماہم میں رہتا تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ



سکتا تھا۔

ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا: "آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی
محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے۔"

چونک کر مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا: "کیوں ——— ؟
کیا ہوا؟"

کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا: "اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو
گیا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"آپ سن تو لیجئے ——— ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے ———
لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے، چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور
کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر بار
سے بالکل غافل ہو گیا ہے ——— داڑھی بڑھا لی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح
ہوتی ہے۔ کام پر کبھی جاتا ہے، کبھی نہیں جاتا ——— کئی کئی دن غائب رہتا ہے
——— وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں، اس لئے
فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ
ملتا ہے ——— فاقہ کشی اللہ تبارک تعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔" کلثوم نے یہ

سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پنڈیا سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی "یہ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟"

کلثوم نے کہا "محمودہ کا تو یہی خیال ہے ——— خیال کیا اس کو یقین ہے۔ گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے۔ کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے۔"

مستقیم تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی میں لیٹ کر سوچنے لگا "یہ کیا ہوا ——— ایسا شوہر تو وبالِ جان ہوتا ہے ——— غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں ——— لیکن سوال یہ ہے اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے ——— کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہوگا؟ ——— نہیں نہیں، اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اس کے چچا نے کی تھی۔ ڈونگری ——— ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو ——— نہیں جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے کیوں کرتی ——— کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے



——— پاگل ہوئے ہو مستقیم ——— ہوش کے ناخن لو۔"

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کر لیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیکار کی مغز پاشی تھی۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔

مستقیم نے پوچھا "کیا مطلب؟"

کلثوم نے جواب دیا "مطلب یہ کہ اب وہ رات کو ایک سیکنڈ کے لئے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے ——— محمودہ غریب روتی رہتی ہے ——— میں کل اس کے پاس گئی تھی۔ ——— بے چاری کو کئی دن کا فاقہ تھا" میں وہیں دو روپے دے آئی کیونکہ میرے پاس اتنے ہی تھے۔"

مستقیم نے کہا "بہت اچھا کیا تم نے ——— جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہوتا کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔ تاکہ غریب کو فاقوں کی نوبت نہ آئے۔"

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا "اصل میں بات کچھ اور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل واگل ہرگز نہیں — بات یہ ہے کہ وہ ......"

"وہ کیا؟"

"وہ ...... عورت کے قابل نہیں ...... یہ نقص دور کرنے کے لئے وہ فقیروں اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے۔"

مستقیم نے کہا: "یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے — محمودہ کے لئے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے!"

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر محمودہ کی حالتِ زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہوگی جس کا شوہر بالکل صفر ہو — کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہوگا — کتنی ناامیدی ہوگی غریب کو، جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہوگا — اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہوگا — جب زندگی میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہوگی تو بے چاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہوگا — اب کیا کرے گی — ایسا نہ ہو خودکشی کر لے — دو برس تک اس نے کسی کو راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا



خدا اس کے حال پر رحم کرے!"

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھٹیوں میں پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں ڈھائی مہینے رہے۔ واپس آ کر ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا — وہ محمودہ کے ہاں نہ جا سکی۔ لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی، اس کو مبارکباد دینے کے لئے آئی۔ اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا: "کچھ سنا تم نے — وہ محمودہ ہے نا، بڑی بڑی آنکھوں والی؟"

کلثوم نے کہا: "ہاں ہاں — ڈونگری میں رہتی ہے۔"

"خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بُری باتوں پر مجبور کر دیا ہے۔" کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا: "کیسی بُری باتوں پر؟"

"اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا ہو گیا ہے۔"

"جھوٹ۔" کلثوم کا دل دھک کرنے لگا۔

کلثوم کی سہیلی نے کہا: "نہیں کلثوم، میں جھوٹ نہیں کہتی — میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو مجھے معلوم ہوتا تھا باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اب اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔"

"یہ تم نے بہت بری خبر سنائی ــــ خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے ــــ ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو۔"
کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی "دوست چوروں کی طرح دروازہ کھول کر جایا نہیں کرتے؟"

کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں رویا تھا پر جب کلثوم نے اسے یہ اندوہناک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا: "یہ بڑی خوفناک بات ہے ــــ تم ایسا کرو، ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ۔"

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا: "میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔"

"کیوں؟" مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس میری مرضی ــــ وہ میرے گھر میں کیوں رہے ــــ اس لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟" کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔



مستقیم کو بہت غصہ آیا، مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا بالکل فضول ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو ٹال کر محمودہ کو لے آئے ــــ مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خدا کا احساس تھا۔ دراصل اس نے کسی گندے زاویۂ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا ــــ البتہ اس کی آنکھیں اس کو واقعی پسند تھیں۔ اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا ــــ مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، کبھی خیرات نہیں دی تھی ــــ خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلوا کر اس کی کسی اور سے شادی کرا دے ــــ مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ وہ بیوی کا ذلیل تھا۔

بہت دیر تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کی کہ اس کی بیوی رضامند ہو جائے، مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا، ایسی کوششیں لاحاصل تھیں۔

مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم، محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔

مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز کے بعد محمودہ کا نام تک نہ لیا۔
اب کیا ہو سکتا تھا ــــــ مستقیم خاموش ہو رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھڑکی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستیقم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا ــــــ محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں ــــــ وہ ایک یہودن کے ساتھ جو اس گھر میں رہتی تھی، باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان لڑکیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کراتی تھی ــــــ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ طور پر میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ ناپاک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی ــــــ وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا ــــــ کیونکہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب کمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی ــــــ مستقیم کے سامنے جب بھی اس کی بے ہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا



چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا یہ مستقیم! جو کچھ تم نے دیکھا ہے، اس کے باعث تم ہو ــــــ کیا ہو جاتا اگر تم اپنی بیوی کی چند روزہ ناراضی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ غصے میں آ کر اپنے میکے چلی جاتی ــــــ مگر محمودہ کی زندگی اس گندگی سے تو بچ جاتی جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے ــــــ کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی ــــــ اگر تم بھائی بن کے اور بھائی بن کے رہتے تو کلثوم ایک نہ ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی ــــــ تم نے بڑا ظلم کیا ــــــ بہت بڑا گناہ کیا؟

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا ــــــ کچھ بھی نہیں۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخریں اکسیجن سنگھانے والی بات تھی۔

تھوڑے دنوں کے بعد بمبئی کی فضا فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبئی چھوڑ دے ــــــ چنانچہ جو پہلا جہاز ملا اس کی سیٹیں بک کرا کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا۔
ڈھائی برس کے بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا، اس لیے مستقیم نے ملازمت کا

خیال ترک کر دیا ــــ ایک روز شام کو دکان سے اُٹھ کر وہ ٹہلنے ٹہلتا صدر جا نکلا ــــ جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا ــــ کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ بیٹھی پان لگا رہی ہے۔ مجھے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا غازہ میک اپ ہے۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے ــــ مستقیم کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا۔ "ادھر آؤ دولھا میاں ــــ تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں ــــ ہم تمہاری شادی میں شریک تھے!"

مستقیم بالکل بھیگ گیا۔

# پھسپھسی کہانی

سخت سردی تھی۔

رات کے دس بجے تھے۔ شالامار باغ سے وہ سڑک جو اُدھر لاہور کو آتی ہے سنسان اور تاریک تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔

گرد و پیش کی ہر چیز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سڑک کے دو رویہ پست قد مکان اور درخت دھندلی دھندلی روشنی میں سکڑے سکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے ایک دوسرے سے دور دور ہٹے ہوئے روٹھے اور اکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ساری فضا میں بد مزگی کی کیفیت تھی۔ ایک صرف تیز ہوا تھی

جو اپنی بے جودگی چھونے کی بیکار کوشش میں مصروف تھی۔

جب وہ سائیکل سوار نمودار ہوئے اور ہوا کے تیز و تند جھونکے ان کے کانوں سے ٹکرائے تو انہوں نے اپنے اپنے اوور کوٹ کا کالر اونچا کر لیا۔ دونوں خاموش تھے۔ مخالف ہوا کے باعث انہیں پیڈل چلانے میں کافی زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ اس کے احساس سے غافل ایک دوسرے کا سایہ بنے شالامار باغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر کوئی انہیں دور سے دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ سڑک جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، ان کی سائیکلوں کے ساکت پہیوں کے نیچے ہو ہو کے کھسک رہی ہے۔

بہت دیر تک وہ دونوں سنسان فاصلہ خاموشی میں طے کرتے رہے۔

آخر ان میں سے ایک سائیکل سے اتر کر اپنے سرد ہاتھ کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنے لگا۔ "سخت سردی ہے۔"

اس کے ساتھی نے بریک لگائی اور ہنسنے لگا۔ "بھائی جان، وہ —— وہ وسکی کہاں گئی؟"

"جہنم میں —— جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوتی۔"

دونوں بھائی تھے، مگر ایسے بھائی جو بازاروں عیب شرعی اکٹھے مل جل کے کرتے تھے۔ دونوں نے صبح یہ پروگرام بنایا تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر رشوت کے



اس روپے کا جو انہیں دو بجے کے قریب ملنا تھا، جائز استعمال سوچیں گے۔

روپیہ انہیں دو بجے سے پہلے ہی مل گیا۔ اس لئے کہ رشوت دینے والا بہت بے قرار تھا۔ بڑے بھائی نے روپیہ جیب میں رکھنے سے پہلے تمام نوٹ اچھی طرح دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا کہ وہ نشان زدہ نہیں تھے۔ رقم زیادہ نہیں تھی۔ دو سو ایک روپے تھے۔ انہوں نے دو سو طلب کئے تھے مگر ایک کا اضافہ رشوت دینے والے نے شگن کے لئے کیا تھا جو بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے مشورہ کر کے ایک اندھے بھکاری کو دے دیا تھا، جب وہ دونوں ہیرا منڈی کی طرف جا رہے تھے۔

چھوٹے بھائی کی جیب میں اسکاچ کی بوتل تھی۔ بڑے کی جیب میں نمبر فائیو کے دو ڈبے۔ عام طور پر دونوں گولڈ فلیک پیتے تھے، مگر جب رشوت ملتی تو ایسا برانڈ پیتے تھے جس کے دام زیادہ ہوں۔

ہیرا منڈی میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ بادشاہی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ بڑے نے چھوٹے سے کہا "چلو یار نماز پڑھ لیں۔"

چھوٹے نے اپنی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا "اس کا کیا کریں بھائی جان؟"

بڑے نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا "اس کا انتظام کر لیتے ہیں —— اپنا یار بٹ جو ہے۔"

بٹ پان فروش کی دکان قریب ہی تھی۔ چھوٹے نے میگزین کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل اس کے حوالے کی۔ بڑے نے اپنی اور اپنے بھائی کی سائیکل دکان کے تختے کے ساتھ ٹکائی اور بٹ سے کہا "ہم ابھی آئے نماز پڑھ کے۔"

بٹ نے قہقہہ لگایا "دو نفل شکرانے کے بھی۔"

دونوں بھائیوں نے بادشاہی مسجد میں نماز ادا کی اور دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بٹ کی دکان بند ہے۔ ساتھ والے دکاندار سے پوچھا تو اس نے کہا "نماز پڑھنے گیا ہے۔"

دونوں بھائیوں کو سخت تعجب ہوا "نماز؟"

دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا "سال چھ ماہ میں کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا ہے۔"

دونوں بہت دیر تک بٹ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ آیا تو بڑے نے چھوٹے سے کہا "جاؤ یار ۔۔۔ ایک بوتل اور لے آؤ ۔۔۔ میں نے خواہ مخواہ اس حرامزادے بٹ پر اعتبار کیا۔"

چھوٹے نے روپے لئے اور بڑے سے کہا "جیب ہی میں پڑی رہتی تو کیا برا تھا؟"

"سچ پوچھو یار ۔۔۔ چھوڑو اس قصے کو ۔۔۔ مجھے بوتل جانے کا اتنا افسوس نہیں ۔۔۔ کہیں گر کر بھی ٹوٹ سکتی تھی ۔۔۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بٹ



بے دردی سے پی رہا ہوگا کم بخت۔"

چھوٹے نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور پوچھا "آپ یہیں ہوں گے؟"

بڑے نے بڑے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا "ہاں بھئی یہیں کھڑا رہوں گا ۔۔۔ شاید بٹ کا ادھر آ نکلے ۔۔۔ لیکن تم جلدی آجانا۔"

چھوٹا جلدی واپس آگیا، مگر اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو کیریر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا تاڑ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنا نہ پڑا، کیونکہ چھوٹے نے سائیکل سے اترتے ہی اس کو سارا واقعہ سنا دیا۔

شراب کی دکان سے دوسری بوتل لے کر جونہی وہ باہر نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ اسے جلد واپس پہنچنا تھا۔ افراتفری میں اس نے سائیکل پر سوار ہونے کی کوشش کی مگر وہ ایسی پھسلی کہ سنبھالے نہ سنبھلی۔ سڑک پر اوندھے منہ گرا اور دوسری بوتل بھی جہنم میں چلی گئی۔

چھوٹے نے ساری داستان تفصیل کے ساتھ سنا کر اللہ کا شکر ادا کیا "میں بچ گیا بھائی جان ۔۔۔ بوتل کا کوئی ٹکڑا اگر کپڑے چیر کر گوشت تک پہنچ جاتا تو اس وقت کسی ہسپتال میں پڑا ہوتا۔"

بڑے نے اللہ کا شکر ادا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ شراب کی دکان سے جو آدمی

اس کے بھائی کے ساتھ آیا تھا اس کو تیسری بوتل کے پیسے دے کر اس نے
بٹ پان فروش کی بند دکان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ایک بہت بھیانک
قسم کی گالی دے کر اس کی دکان کو بھسم کر ڈالا۔

دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ چوک کے اس طرف نان کباب
والے کے اوپر جو بالا خانہ تھا، اسی میں ان دونوں بھائیوں کی بالائی آمدنی کا جائز
نکاس ہوتا تھا۔ لونڈیا کم گو تھی۔ کھانے پینے والی تھی۔ عادات و اطوار کے لحاظ
سے طوائف کم اور کلرک زیادہ تھی۔ اسی لئے ان کو پسند تھی کہ وہ خود بھی کلرک
تھے۔ جب دونوں خوب پی جاتے تو دفتری گفتگو شروع کر دیتے۔ ہیڈ کلرک کیسا
ہے، صاحب کیسا ہے، اس کے گھر والی کی طبیعت کیسی ہے۔ گھنٹوں اپنے
اپنے ماتحتوں اور اپنے افسروں کے ماضی اور حال پر تبصرہ کرتے رہتے اور وہ
بڑے انہماک سے سنتی رہتی۔

بہت کم بولتی تھی، مگر دونوں بھائی اس کا گانا سن کر یوں محسوس کرتے جیسے
وہ ان کے کانوں میں شہد ٹپکا رہی ہے ـــــ لیکن آج جب وہ گانے لگی تو ان کو
پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ سُر سے بے تال ہے۔ چنانچہ اس کا گانا بند کرا کے انہوں
نے باقی بچی ہوئی شراب پینا شروع کر دی۔

طوائف جس کا نام شیداں تھا، بہت کم پینے والی تھی مگر جانے اسے کیا ہوا



کہ جب ان دونوں بھائیوں نے اس کا گانا بند کرا کے پینا شروع کی تو وہ بہک گئی
اور ایسی بہکی کہ بوتل اٹھا کہ ساری کی ساری غٹ غٹ پی گئی۔

بڑے کو بہت غصہ آیا، مگر وہ اسے پی گیا۔ کیونکہ چھوٹا بڑے مزے میں تھا۔
لیکن زیادہ دیر تک اس پر یہ کیفیت طاری نہ رہی۔ کیونکہ جب اس نے اور پینے کے
لئے بوتل اٹھائی تو وہ خالی تھی۔ اب دونوں یکساں طور پر بے مزہ تھے۔

بڑے نے چھوٹے سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شیداں کے استاد ماکھا
کو روپے دے کر اس نے کہا "جاؤ، بھاگ کر جاؤ اور ایک بوتل بھانا دکی
لے آؤ۔"

استاد نے روپے گن کر جیب میں رکھے اور کہا "سرکار! بلیک میں
ملے گی۔"

بڑا جو پہلے ہی بھنّایا ہوا تھا چلا کر بولا "ہاں ہاں ـــــ جانتا ہوں، اسی
لئے تو میں نے پانچ زیادہ دئے ہیں۔"

بھانا آئی۔ دو دو پیگ پیے تو بڑے نے محسوس کیا کہ پانی ملی ہے۔ امتحان
لینے کی خاطر اس نے تھوڑی سی رکابی میں ڈالی اور اس کو دیا سلائی دکھائی۔ ایک
لمحے کے لئے نیم جان نیلگوں سا دھواں اٹھا اور دیا سلائی شوں کر کے رکابی میں
بجھ گئی۔

دونوں بھائیوں کو اس قدر کوفت ہوئی کہ غصے میں بھرے ہوئے اٹھے۔ بڑے نے پانی ملی بوتل ہاتھ میں لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ وہ اس شراب فروش کے سر پر دے مارے گا جس نے بے ایمانی کی تھی، مگر فوراً اسے خیال آیا کہ ان کے پاس پرمٹ نہیں تھا۔ اس لئے مجبوراً گالیاں دے کر خاموش ہو گئے۔

چھوٹے کی کوششوں سے بدمزگی کسی حد تک دور ہوئی تھی کہ شیدان نے جو اس کی مدد کر رہی تھی سب کھلایا پلایا اگلنا شروع کر دیا۔ اب دونوں بھائیوں نے مناسب خیال کیا کہ چلا جائے۔ چنانچہ استاد کی تحویل سے سائیکلیں لے کر وہ ہیرا منڈی کی گلیوں میں دیر تک بے مقصد گھومتے رہے، مگر اس آوارہ گردی کے باوجود ان کی کوفت دور نہ ہوئی۔ واپس گھر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ انہیں بٹ دکھائی دیا۔ نشے میں دھت تھا اور رکشوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر واہی تباہی بک رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیں مگر ان سے پہلے ایک سپاہی نے اس کو پکڑ لیا اور تھانے لے گیا۔

چھوٹے نے بڑے سے کہا "چلئے بھائی جان ——— ذرا تماشہ دیکھیں۔"

بڑے نے پوچھا "کس کا؟"

"بٹ کا اور کس کا؟"



بڑے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "پاگل ہوئے ہو ——— تھانے میں اگر اس نے ہمیں پہچان لیا یا کسی نے ہمارے منہ کی بو سونگھ لی تو ہمیں اپنا تماشہ بھی ساتھ ساتھ دیکھنا پڑے گا۔"

چھوٹے نے دل ہی دل میں بڑے کی دور اندیشی کی داد دی اور کہا "تو چلئے ——— گھر چلیں!"

دونوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سرد ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ ابھی وہ ہیرا منڈی سے باہر نہیں نکلے تھے کہ انہیں اس تانگے میں جو ان کے آگے آگے چل رہا تھا اپنے دفتر کا بڑا افسر نظر آیا۔ دونوں نے ایک دم اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ کیونکہ وہ انہیں دیکھ چکا تھا۔

"ہلو!"

انہوں نے اس ہلو کا جواب نہ دیا۔

"ہلو!"

اس ہلو کے جواب میں انہوں نے اپنی اپنی سائیکل روک لی ———

افسر نے تانگہ ٹھہرایا اور ان سے بڑے مربیانہ انداز میں کہا "کہو مسٹر عیش ہو رہے ہیں؟"

چھوٹے نے "جی ہاں!" اور بڑے نے "جی نہیں!" میں جواب دیا۔ اس
پر افسر نے قہقہہ لگایا۔ "میرا عیش تو ادھورا رہا۔" پھر اس نے افسرانہ انداز میں پوچھا
"تمہارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

اس مرتبہ بڑے نے "جی ہاں!" اور چھوٹے نے "جی نہیں!" میں جواب
دیا، جس پر افسر نے دوسرا قہقہہ بلند کیا جو خالصتاً افسرانہ تھا۔ "ایک سو روپے
کافی ہوں گے اس وقت!"

بڑے نے بڑے بیگانگی انداز میں اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ
نکالا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے نے پکڑ کر افسر کے حوالے
کر دیا، جس نے "تھینک یو!" کہا اور تانگے سے اتر کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف
چلا گیا۔

دونوں بھائی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ بڑے نے تمام حالات
پیش نظر رکھ کے اپنے سر کو زور سے جنبش دی: "معلوم نہیں، آج صبح
کس کا منہ دیکھا تھا؟"

چھوٹے کے منہ سے یہ بڑی گالی نکلی: "اسی ...... کا، جس نے دو سو
ایک روپے دیئے؟"

بڑے نے بھی اس کو مناسب و موزوں گالی سے یاد کیا۔ "ٹھیک کہتے ہو



—— لیکن میں سمجھتا ہوں، سارا قصور اس نا قسمت روپے کا ہے جو اس نے اپنی ماں کی
روح سے شگن کے طور پر دیا تھا۔"

"اس نماز کا بھی جو ہم نے پڑھی!"

"اور اس حرامی بیٹے کا بھی!"

"میں تو شکر کرتا ہوں کہ پولیس نے اس کو پکڑ لیا، ورنہ میں نے آج ضرور
اس کا خون کر دیا ہوتا۔"

"اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔"

"لینے کے دینے تو پڑ ہی گئے —— خدا معلوم یہ حرامی افسر کہاں سے
آن ٹپکا!"

"لیکن میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا —— سو روپے میں سالا اُلّو تو ہو گیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے —— لیکن آج کی شام بہت بُری طرح غارت ہوئی۔"

"چلو چلیں —— ایسا نہ ہو کوئی اور آفت آ جائے۔"

دونوں بھائی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے اور ہیرا منڈی سے نکل آئے۔
بڑے نے دفتر سے نکلتے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اسکاچ کے دو تین دور
ہونے کے بعد وہ شیداں سے کہے گا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو بلائے۔ اس کی
بہت تعریفیں کیا کرتی تھی۔ کم عمر اور الھڑ تھی۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے

گاؤں کی صحت مند فضا میں گزارا تھا اور دوسرا شروع کرنے سے اسے بمشکل چند مہینے ملے تھے۔

اسکاچ وہسکی اور شیمپین کی چھوٹی بہن —— اس سے بڑھ کر اور عیاشی کیا ہو سکتی تھی —— مگر اس کا یہ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا اور صرف کوفت باقی رہ گئی۔

چھوٹے نے بھی گول کھیلنے کی سوچی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وہسکی اور شیمپین یقینی طور پر اسے اور بھی خوشگوار بنا دیتے اور وہ اس قدر محظوظ ہوتا کہ پندرہ بیس روز تک اسے اور کسی عیش کی ضرورت محسوس نہ ہوتی —— مگر سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

دونوں کے سر بھاری اور دل کڑوے کسیلے تھے۔ دونوں کی ہر بات الٹی ثابت ہوئی تھی۔ اسکاچ کی بوتل بدذات پان فروش لے اڑا، دوسری سڑک کے پتھروں پر ٹوٹ کر بہہ گئی۔ تیسری عین اس وقت داغ مفارقت دے گئی جب کہ سرور گھونٹ رہے تھے۔ چوتھی کفایت کی خاطر دیسی منگوائی تو اس میں آدھا پانی نکلا۔ اور سو کا آخری نوٹ افسر نے ہتھیا لیا۔

بڑے کی کوفت زیادہ شدید تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اور بھی کچھ ہو —— کوئی ایسی بات ہو کہ وہ کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنا شروع کر دے —— یا ایسا کچھ



ہو کہ اپنی سائیکل کے پرزے اڑا دے، اپنے تمام کپڑے اتار کر پھینک دے اور ننگ دھڑنگ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ جس طرح حالات نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا، اسی طرح وہ ان کا مضحکہ اڑانا چاہتا تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ حالات پیدا ہو کر وہیں بے چارگی میں وفات پا گئے تھے۔ اب نئے حالات اور وہ بھی ایسے حالات کیسے پیدا ہوں جن کا وہ حسب منشا مضحکہ اڑا سکے۔ اس کے متعلق سوچنے سے وہ خود کو عاری پاتا تھا۔

ایک صرف گھر تھا، جہاں وہ لحاف اوڑھ کر سو سکتے تھے —— مگر خالی خولی لحاف اوڑھ کر سو جانے میں کیا رکھا تھا۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ وہ سو سو کے دو نوٹوں میں چرس یا تمباکو بھرتے اور پی کر بالکل غافل ہو جاتے۔ اور صبح اٹھ کر گنتی کے ایک روپے کا کسی پیر فقیر کے مزار پر چڑھاوا چڑھا جاتے۔

سوچتے سوچتے بڑے نے زور کا نعرہ بلند کیا: "ہت تیری ایسی کی تیسی تھا؟"

چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا: "پنکچر ہو گیا؟"

بڑے نے جھنجھلا کر جواب دیا: "نہیں یار —— میں نے اپنا دماغ پنکچر کرنے کی کوشش کی تھی۔"

چھوٹا سمجھ گیا: "اب جلدی گھر پہنچ جائیں۔"

بڑے کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا: "وہاں کیا کریں گے —— بھڑوں کے

بال مونڈیں گے؟"

چھوٹا بے اختیار ہنسنے لگا۔ بڑے کو یہ ہنسی بہت ناگوار گزری "یہ خاموش رہو جی!"

دیر تک دونوں خاموشی میں گھر کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ اب وہ اس سڑک پر تھے جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ان کی سائیکلوں کے پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔

بڑے نے جب اپنے سرد ہاتھ منہ کی بھاپ سے گرم کئے اور کہا "سخت سردی ہے" تو چھوٹے نے ازراہِ مذاق پوچھا "بھائی جان! وہ ——— وہ لڑکی کہاں گئی؟"

بڑے کے جی میں آئی کہ چھوٹے کو سائیکل سمیت اٹھا کر سڑک پر پٹک دے مگر اس قدر کہہ سکا "جہنم میں ——— جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوئی۔"

یہ کہہ کر وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ اتنے میں چھوٹے نے آواز دی "بھائی جان! وہ دیکھئے کون آ رہا ہے۔"

بڑے نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی، کانپتی، قدم لیا سے راستہ ٹٹولتی، ان کی جانب آ رہی تھی۔ جب پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اندھی



آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کو سجھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ کھمبے کے ساتھ وہ ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

بڑے نے غور سے اس کی طرف دیکھا ——— جوان تھی۔ عمر یہی سولہ سترہ برس کے قریب ہوگی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی اس کا سڈول بدن جاذبِ توجہ تھا۔ چھوٹے نے اس سے پوچھا "کہاں جا رہی ہے تو؟"

اندھی نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "راستہ بھول گئی ہوں ——— گھر سے آگ لینے کے لئے نکلی تھی۔"

بڑے نے پوچھا "تیرا گھر کہاں ہے؟"

اندھی بولی "پتا نہیں ——— کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔"

بڑے نے اس کا ہاتھ پکڑا "چل میرے ساتھ۔"

اور وہ اسے سڑک کے اس پار لے گیا جہاں اینٹوں کا پرانا بھٹہ تھا جو ویرانے کے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ اندھی سمجھ گئی کہ اس کو راستہ بتانے والا اسے کس راستے پر لے جا رہا ہے، مگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی ——— شاید وہ ایسے راستوں پر کئی مرتبہ چل چکی تھی۔

بڑا خوش تھا کہ جلد کوفت دور کرنے کا سامان بن گیا۔ کسی کی مداخلت کا کھٹکا بھی نہیں تھا۔ اوور کوٹ اتار کر اس نے زمین پر بچھایا اور وہ اور اندھی دو

بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اندھی جنم کی اندھی نہیں تھی۔ فسادات سے پہلے وہ اچھی بھلی تھی لیکن جب سکھوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تو بھگدڑ میں اس کے سر پر گہری چوٹ لگی جس کے باعث اس کی بصارت چلی گئی۔

بڑے نے اوپرے دل سے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دو روپے جیب سے نکال کر اس نے اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کہا: "کبھی کبھی ملتی رہا کرنا ــــ میں تمہیں کپڑے بھی بنوا دوں گا۔"

اندھی بہت خوش ہوئی۔ بڑے نے جب اس کو اپنی روشن آنکھوں اور پھر پتلے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹولا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس کی کوفت کافی حد تک دور ہو گئی لیکن ایک دم اسے اپنے چھوٹے بھائی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی: "بھائی جان ــــ بھائی جان!"

بڑے نے پوچھا: "کیا ہے؟"

چھوٹا سامنے آیا۔ بڑے خوف زدہ لہجے میں اس نے کہا: "دو سپاہی آ رہے ہیں۔"

بڑے نے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اپنا اوورکوٹ کھینچا جس پر



اندھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جھٹکے سے وہ اس خندق میں گر پڑی جس میں سے پکی ہوئی اینٹیں نکال لی گئی تھیں۔ گرتے وقت اس کے منہ سے بلند چیخ نکلی مگر دونوں بھائی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

چیخ سن کر سپاہی آئے تو انہوں نے بے ہوش اندھی کو خندق میں سے باہر نکالا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا ــــ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے سپاہیوں کو یوں دیکھنا شروع کیا جیسے وہ بھوت ہیں۔ پھر ایک دم دیوانہ وار چلانے لگی: "میں دیکھ سکتی ہوں ــــ میں دیکھ سکتی ہوں ــــ میری نظر واپس آ گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ سے جو دو روپے گرے وہ سپاہیوں نے اٹھا لیے۔

# بھنگن

"پرے ہٹئے ـــ"

"کیوں؟"

"مجھے آپ سے بُو آتی ہے۔"

"ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بُو ہوتی ہے ـــ آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟"

"بیس برس ـــ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔"

"میں نے کبھی آپ کو اس عرصہ میں تکلیف پہنچائی؟"



"جی کبھی نہیں"

"تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بُو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاء اللہ کافی لمبی ہے اتنی غضب ناک ہو رہی ہے؟"

"آپ اپنی ناک تو دیکھئے ـــ پکوڑا سی ہے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کرتا ـــ پکوڑے، تم جانتی ہو مجھے بہت پسند ہیں۔"

"آپ کو تو ہر واہیات چیز پسند ہوتی ہے ـــ کوڑے کرکٹ سے بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔"

"کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلایا ہوتا ہے ـــ اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے ـــ اور تم جانتی ہو آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہو گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔"

"بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔"

"بھئی کرم کا سوال نہیں ـــ فارسی کا ایک شعر ہے ؎

خاکساراں را بہ حقارت منگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

"میں خاک بھی نہیں سمجھی۔"

"یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا ـــ ورنہ بیس برس ایک

آدمی کو پہچاننے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔"

"ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا لمحہ پہچانا ہے مجھے؟"

"تم لمحہ کی بات کرو ـــــ بتاؤ میں نے کون سا لمحہ تمہیں اس عرصے میں پہچانا؟"

"ایک بھی نہیں۔"

"تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا ـــــ ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا لمحہ پہچانا ہے مجھے؟"

"آپ میرے قریب نہ آئیے ـــــ میں سونا چاہتی ہوں۔"

"اس غصے میں نیند آجائے گی تمہیں؟"

"خاک آئے گی ـــــ بہرحال ـــــ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور..."

"اور کیا کریں گی؟"

"لیٹی اس دن پہ آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلے باندھی گئی۔"

"تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا ـــ سن کیا تھا ـــ وقت کیا تھا؟"

"میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں ـــ خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے۔"

"تم بتا تو دو ـــــ میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"

"اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے ـــ بیٹھے بٹھائے ـــ مجھے آپ سے



جا رہی ہے۔"

"بھئی حد ہو گئی ہے ـــــ تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی اس کو آخر کیا ہو گیا ہے ـــــ مجھ سے تو اس کو ایسی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہئے ـــــ تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"دیکھیو ـــــ میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا ـــــ تم مجھ پہ یہ الزام نہ دھرو۔"

"واہ جی واہ، بڑے آئے ہیں آپ کہیں کے سچے ـــــ میرا سو روپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف مکر گئے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"دو جون سن انیس سو بیالیس کو ـــــ جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔"

"یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔"

"کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے تکیے کے نیچے

سے نکال۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو روپے
تھے ان میں سے ایک نوٹ اٹھا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں
کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے پوچھ ہوئی۔ مگر آپ سٹے کر پیروں پر پانی ہی نہیں
پڑنے دیتے۔ آخر میں خاموش ہو گئی۔"

"یہ دو جنوری سن انیس سو بیالیس کی بات ہے — آج کل سن چون چل رہا
ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟"

"فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے — میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی
آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"دیکھو میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے
کچھ معلوم نہیں —"

"اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق؟"

"اب تمہاری جان کی قسم کھائی ہے تو سچ بتانا ہی پڑے گا — میں نے
— میں نے چرایا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے
والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ تو دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری
ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔"

"بڑے تحفے تحائف دیے ہیں آپ نے مجھے۔"



"ناشکری تو نہ کرو۔"

"میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے — مجھے آپ سے
بو آتی ہے۔"

"کس کی؟"

"یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔"

"میں نے خود کو کئی مرتبہ سونگھا ہے، مگر میری کم بخت ایسی ناک میں ایسی کوئی
بو نہیں گھسی جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔"

"آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔"

"اور باتیں بگاڑنا تم — میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم اس قدر ناراض
کیوں ہو۔"

"اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے۔"

"میں اس وقت قمیص پہنے نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"سخت گرمی ہے۔"

"سخت گرمی ہو یا نرم — آپ کو قمیص تو نہیں اتارنا چاہیے تھی۔ یہ
کوئی شرافت نہیں۔"

"محترمہ! آپ نے بھی تو قمیص اتار رکھی ہے ——— اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمایئے۔"

"اوہ ——— یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے۔"

"یہ واہیات پن تو آپ گزشتہ بیس برس سے کر رہی ہیں۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"خیر جھوٹ بولنا تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔"

"آپ مجھ سے دور ہی رہیے۔"

"کیوں؟"

"توبہ ——— لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آ رہی ہے۔"

"پہلے صرف بو تھی ——— اب گندی ہو گئی۔"

"خبردار جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔"

"اس قدر بیزاری آخر کیوں؟"

"میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔"

"ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"اب تو کر دیا ہے۔"



"لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے۔"

"تمہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے؟"

"آپ ناپاک ہیں ——— بے حد ذلیل ہیں۔"

"دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔"

"آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔"

"کون سی؟"

"آج صبح کیا ہوا تھا؟"

"آج صبح؟ ——— بارش ہوئی تھی۔"

"بارش ہوئی تھی ——— لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا تھا؟"

"اوہ!"

"بس اس کا جواب اب 'اوہ' ہی ہو گا ——— میں نے پکڑ لیا آپ کو۔"

"دیکھو میری جان ———"

"مجھے اپنی جان وان مت کہئے ——— آپ کو شرم آنی چاہیئے۔"

"کس بات پر — کس گناہ پر؟"

"میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے — لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔"

"میں کس گندگی میں گرا ہوں؟"

"آج صبح آپ نے اس — اس......"

"کیا؟"

"اس بھنگن کو — جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

"لاحول ولا — تم بھی عجیب عورت ہو — وہ غریب حاملہ ہے۔ بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟"

"ہائے — بے چاری — میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔"

"میرے قریب آجاؤ — میں تمہیں پہن لوں؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری قمیص ہی بہت ہے۔"

# ممد بھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوران ہوتے ہیں مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رنڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھئے کہ بیس برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر "پلے ہاؤس" آتا ہے۔ ادھر دن بھر ہاؤ ہو رہتی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سینما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے

باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سماعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے
"آؤ آؤ —— دو آنے میں —— فسٹ کلاس کھیل —— دو آنے میں!" ——
بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے
تھے۔ باہر کرسیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی
مرمت بڑے سائنٹفک طریقے پر کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے، لیکن میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔
دن کو اور رات کو ہر وقت انہیں تیل مالش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے
آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔
یوں بھی ساری رات آپ خواہ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً
سنتے رہیں گے "پی —— پی —— پی"
"پی" چمپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے، لیکن دراصل یہ اس پورے
علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔
اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں، لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر
گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلہ لگی دکانیں ہیں
جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر،



آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک، آٹھ روپے سے سو روپے تک —— ہر دام
کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔
یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی،
جاپانی، غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے ——
یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں —— معاف کیجئے گا، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ
پوچھئے —— بس عورتیں ہوتی ہیں —— اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔
اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے
ہیں، مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر
بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے —— معلوم
نہیں کیا ——

اس علاقے میں ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے
جس کا نام عرب سین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس
زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہوں اس گلی میں غالباً بیس پچیس عرب رہتے
تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں —— اور
رامپوریوں پر مشتمل تھی۔
اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا

ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

"آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اور اس کا نام ممد بھائی تھا۔"

ممد بھائی رامپور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا۔ لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا۔ لیکن مجھے ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں۔ کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔



لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی یہ صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا۔ لیکن یوں اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہے۔ عرب گلی ۔۔۔ صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں تھیں ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں، سب ممد بھائی کو جانتی تھیں۔ کیونکہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ تھا جس میں بڑا تندرست ٹٹو جتا ہوتا تھا اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے، بڑے باادب۔ بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا کر یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے پر واپس عرب گلی آ جاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ گتکے اور

بندش کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے ممد بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیئے اور ان سے کہا: "دیکھو اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔" عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا: "منٹو صاحب! ممد بھائی فرشتہ ہے — فرشتہ — جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ سالے ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

ممد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا، مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممد دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر ہمیشہ اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا، کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے جھکتے ہوئے



اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممد بھائی تھا۔ اس قسم کا آدمی جو ہرکولیس سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے وانے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا تھا۔ اس دوران میں ممد بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔

ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا، کیونکہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ جو ایک آدمی رہتا تھا اس کو پونے میں نوکری مل گئی تھی، اس لئے

اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کٹورے میں رکھا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا اور دوست یا کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں، دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا، فلو تھا، ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لئے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے تاکہ مجھے یہ خوشگوار احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں لیتا رہا، مگر کوئی نہ آیا۔ آنا بھی کسے تھا ــــ میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے ــــ دو تین یا چار۔ اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا ــــ اور پھر وہاں بمبئی میں کون کس کو پوچھتا ہے ــــ کوئی مرے یا جئے ــــ ان کی بلا سے ــــ

میری بہت بری حالت تھی۔ عاشق حسین فوٹو گرافر کی بیوی بیمار تھی اس لئے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا۔



بڑی نڈھال حالت میں تھا، اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا ہے جسے بمبئی کی زبان میں باہر والا کہتے ہیں ہوگا۔ بڑی مریل آواز میں کہا: "آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں، اندر داخل ہوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا: "ونٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟" منٹو کا ونٹو بن جانا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں اس موڈ میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف

آواز میں اس کی مونچھوں سے صرف اتنا کہا "یہ آپ کون ہیں؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا "ممد بھائی!"

میں اچھل کر بیٹھ گیا "ممد بھائی — تو — تو آپ ممد بھائی ہیں — مشہور دادا —"

میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن فوراً مجھے اپنے غلط لہجے کا احساس ہوا اور رک گیا۔ ممد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کیے اور مسکرایا "ہاں منٹو بھائی — میں ممد ہوں — یہاں کا مشہور دادا — مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو — سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا "ارے — کیا نام ہے تیرا — جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا — سمجھ گئے نا، اس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے — ایک دم جلدی آ — ایک دم — سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ — اور دیکھ، سالے سے کہنا سب دوائیں لیتا آئے۔"

ممد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا، میں اس کو دیکھ رہا تھا — وہ تمام داستانیں میرے بخار آلود دماغ میں چل پھر رہی تھیں



جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا — لیکن گڈمڈ صورت میں، کیونکہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوفناک، مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں، صرف خوفناک بنانے کے لیے یہ مونچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

کھولی میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں نے ممد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے، مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے — ہم کھڑے رہیں گے۔"

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے — حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کرتے کا دامن اٹھا کر پاجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا — میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر گیا تھا۔ میں نے اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا "ممد بھائی — یہ چھری تم اس طرح

اپنے...... نیفے میں — یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو۔ اتنی تیز ہے
کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟"

ممد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے
جواب دیا: "وشو بھائی — یہ چھری دوسروں کے لئے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی
ہے۔ سالی اپنی چیز ہے۔ مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟"

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں
یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آ گیا — اس کا نام پنٹو تھا، اور میں وشو — اس نے ممد بھائی
کو اپنے کرسچین انداز میں سلام کیا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا، وہ
ممد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر لیکن کڑے الفاظ میں، جن میں حکم تھا کہ دیکھو اگر
تم نے وشو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنٹو نے فرماں بردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی —
سٹیتھوسکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مجھ سے
میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں، ممد بھائی سے
کہا: "کوئی فکر کی بات نہیں — ملیریا ہے — میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنٹو کی بات سن



اور خنجر سے اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا: "میں کچھ نہیں جانتا۔ انجکشن دینا
ہے تو دے دو، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو......"

ڈاکٹر پنٹو کانپ گیا: "نہیں ممد بھائی — سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ممد بھائی نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا: "تو ٹھیک ہے۔"

"تو میں انجکشن لگاتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی —

"ٹھہرو — ٹھہرو۔"

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی، اور
ممیاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا: "کیوں؟"

"بس — میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کھولی
باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنٹو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا۔ بڑے سلیقے سے، ورنہ ملیریا کا
یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس
پوچھی۔ اس نے کہا: "دس روپے!" میں تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوا نکال
رہا تھا کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنٹو کو
دے رہا تھا۔

ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر

کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "یہ فیس دے رہا ہوں۔"

ممد بھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا "سالے یہ فیس کیسی لے رہے ہو؟"

ڈاکٹر پنٹو بوکھلا گیا "میں کب لے رہا ہوں — یہ دے رہے تھے!"

"سالا — ہم سے فیس لیتے ہو — واپس کرو یہ نوٹ!" ممد بھائی کے لہجے میں اس کے خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممد بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرایا "یہ منٹو بھائی — یہی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے — تمہاری قسم اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی — یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا "ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

ممد بھائی کی مونچھیں تھرتھرائیں "ممد بھائی کسے نہیں جانتا — ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے — اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی آئی ڈی



وہ ہمیں رپورٹ دیتی رہتی ہے — کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے، کون بری حالت میں — تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے ازراہِ تفنن پوچھا "کیا جانتے ہیں آپ؟"

"سالا — ہم کیا نہیں جانتے — تم امرتسر کا رہنے والا ہے، کشمیری ہے — یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے — تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لیے تم اُدھر سے نہیں گزرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔"

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا "منٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیئے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر منٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا — اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ بیمار تھا، کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ

میں اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش
کرتا تو اسے بہت محنت کرنی پڑتی ـــــ میں صرف اتنا کہہ سکا "محمد بھائی! خدا
تمہیں زندہ رکھے ـــــ تم خوش رہو۔"

محمد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا
مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "نہیں مسٹر منٹو! محمد بھائی کا معاملہ ہے۔
ایک دھیلا بھی نہیں لے سکتا۔"

میں نے سوچا، یہ محمد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے یعنی خوفناک قسم کا،
جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے
کی جرأت نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بیماری کے دوران میں محمد بھائی بھی بلاناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا تھا کبھی شام
کو۔ اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ، اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس
دیتا تھا کہ معمولی ملیریا ہے۔ تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاءاللہ بہت جلد
ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔"

پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں محمد بھائی کے
خدوخال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔



جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا، عمر یہی
پچیس تیس کے درمیان ہوگی۔ پتلی پتلی باہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا
کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا
تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبتا تھا۔ یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا، میں
اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری مار وہ اول درجے کا تھا، بنوٹ
اور گتکے کا ماہر۔ یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے، مگر میں یہ
اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن میں جھرجھری
سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے
میں اڑسے رہتا ہے؟ ـــــ

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران
میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا وہی خوفناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ
رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "محمد بھائی ـــــ آج کل بندوق پستول کا زمانہ
ہے ـــــ تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟"

محمد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا "منٹو بھائی!

بندوق پستول میں کوئی مزا نہیں۔ انہیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے گھوڑا دبایا اور
ٹھاہ...... اس میں کیا مزا ہے — ! یہ چیز...... یہ خنجر...... یہ چھری......
یہ چاقو...... مزا آتا ہے نا خدا کی قسم — یہ وہ ہے...... تم کیا کہا کرتے
ہو...... ہاں...... آرٹ...... اس میں آرٹ آتا ہے میری جان......
جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا
ہے — کھلونا ہے — جو نقصان پہنچا سکتا ہے — پر اس میں کیا لطف
آتا ہے — کچھ بھی نہیں — تم یہ خنجر دیکھو — اس کی تیز دھار دیکھو" یہ
کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا" اس سے
کوئی دھماکہ نہیں ہوتا — بس، یوں پیٹ کے اندر داخل کر دو — اس صفائی
سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو...... بندوق پستول سب بکواس ہے۔"

ممد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا
ممنونِ احسان تھا — لیکن جب میں اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا
کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا
وہ ایک قسم کا حاکم تھا۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی
کے کوئی تکلیف ہو، ممد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور یہ اس کی سی آئی ڈی



کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ
وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن
نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی
تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پرورش کرتا تھا جس
طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا، جیسے خارپشت کا — مجھے
کسی نے بتایا تھا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب
کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں
کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک
تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی ممد بھائی تھا — یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ
گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مجھے ان دونوں
چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں —

ممد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد
تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت

مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھیں چونکہ وہ ایک
مانا ہوا غنڈہ تھا، اس لئے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے
ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں
رہا تھا۔

میری اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری
اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کھاتے تھے۔ ایک دن
صبح سویرے، دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ
ممد بھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا، اس لئے کہ تمام تھانے
والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ ۔۔۔ میں نے اس آدمی
سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو ممد بھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ
اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے، جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی
ایک جوان لڑکی ہے، اس کو کل ایک آدمی نے خراب کر دیا۔ یعنی اس کی
عصمت دری کر دی۔ شیریں بائی روتی ہوئی ممد بھائی کے پاس آئی اور اس سے
کہا "تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کیا ہے۔
لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو" ممد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا
کو دی اور کہا "تم چاہتی کیا ہو؟" اس نے کہا "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس



حرام زادے کا پیٹ چاک کر دو۔"

ممد بھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر
اس نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی
اور بڑھیا سے کہا "جا ۔۔۔ تیرا کام ہو جائے گا۔"

اور اس کا کام ہو گیا ۔۔۔ دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا
کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔
ممد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابکدستی
سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی
عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت
پر رہا کر دیا گیا۔

دو دن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس
کے سپاہی، انسپکٹر، سب انسپکٹر، سب اس کو جانتے تھے لیکن جب وہ
ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے
بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اوپر کو اٹھی ہوتی تھیں، اب
کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی کے ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جا بجا

اجلے ہوتے تھے، میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ
کی لیکن اس نے خود کہا: "منٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالا
دیر سے مرا ـــ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا ـــ لیکن
وہ بھی اس سالے کا قصور تھا ـــ ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ
گڑبڑ ہو گیا ـــ لیکن مر گیا ـــ ذرا تکلیف کے ساتھ جس کا مجھے افسوس ہے۔"
آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ سن کر میرا ردِ عمل کیا ہوگا۔ یعنی اس کو افسوس
تھا کہ وہ سالے کو بطریقِ احسن قتل نہ کر سکا۔ اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف
ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا ـــ اور ممد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے
اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے
پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے،
وہ مجسٹریٹ، وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، اس لیے کہ اس کا سابقہ
ان لوگوں سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

وہ بہت فکرمند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ
مقرر ہو گئی تو ممد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے
کیسے حاضر ہوا جاتا ہے، اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی



کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا: "منٹو صاحب! میں مر
جاؤں گا، پر کورٹ میں نہیں جاؤں گا ـــ سالی، معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔"
عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دلائی
کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں۔ ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں
جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پر کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی
ہیں۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس
کو خوفناک بناتی تھیں ـــ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز "دادا" دکھائی نہ دیتا۔
اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے
عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل
میں جب میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔
اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت
میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے، اس کو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس
کے تمام شاگرد حیران تھے۔ اس لیے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس
کو مونچھوں کی فکر تھی۔ کیونکہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا:

"ممد بھائی ۔۔۔ کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔"

اور وہ سوچتا تھا ۔۔۔ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے ۔۔۔ لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر، معلوم نہیں، جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا، یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا، اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گٹر میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا "ممد بھائی! ۔۔۔ یہ کیا؟"

"کچھ نہیں، منٹو بھائی بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے ۔۔۔ یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا ۔۔۔ اب بولو میں کیا کروں؟"

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا "ممد بھائی! بات تو ٹھیک ہے ۔۔۔ تمہاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی ۔۔۔ سچ پوچھو تو جو کچھ ہوگا، تمہارے خلاف نہیں ۔۔۔ مونچھوں کے خلاف ہوگا۔"

"تو میں منڈوا دوں؟" ممد بھائی نے اپنی چہیتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری ۔۔۔



میں نے اس سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال جو کچھ بھی ہے وہ تم نہ پوچھو ۔۔۔ لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انہیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں منٹو بھائی ۔۔۔؟"

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا "ہاں، اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو ۔۔۔ عدالت کا سوال ہے، اور تمہاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔"

دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی مونچھیں ۔۔۔ اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی ۔۔۔ لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر ۔۔۔

مسٹر ایف، ایچ ٹیلی کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ مونچھوں کے بغیر ممد بھائی پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا، اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں ۔۔۔ مگر وہاں کوئی بال

پتا نہیں تھا۔

شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی — مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا: "کیا بات ہے ممد بھائی —"

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا: "سالا اب ممد بھائی ہی نہیں رہا؟"

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے: "کوئی بات نہیں ممد بھائی، — یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سہی"

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں: "سالا — اچھی کرے غم نہیں — یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں — یہ سالا مونچھیں رکھیں منڈائیں؟"

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈانے کا مشورہ دیا تھا



ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا: "سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا —"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا: "سالا تم کیسا آدمی ہے، منٹو — ہم سچ کہتا ہے، خدا کی قسم — ہمیں پھانسی لگا دیتے ..... پر ..... یہ بے وقوفی تو ہم نے خود کی — آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا — سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا" یہ کہہ کر اس نے دوہتڑ اپنے منہ پر مارا: "ممد بھائی لعنت ہے تجھ پر — سالا — اپنی مونچھوں سے ڈر گیا — اب جا اپنی ماں کے ......"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

# "حُسن کی تخلیق"

کالج میں شاہدہ حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کو اپنے حُسن کا احساس تھا اسی
لئے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی اور خود کو مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی
سمجھتی۔ اس کے خدوخال واقعی مغلئی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ نور جہاں کی تصویر جو
اس زمانے کے مصوّروں نے بنائی تھی اس میں جان پڑ گئی ہے۔

کالج کے لڑکے اسے شہزادی کہتے تھے لیکن اس کے سامنے نہیں
پر اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے یہ لقب دیا گیا ہے۔ وہ اور بھی مغرور ہو گئی۔

کالج میں مخلوط تعلیم تھی۔ لڑکے زیادہ تھے اور لڑکیاں کم۔ آپس میں ملتے
جلتے، لیکن بڑے تکلّف کے ساتھ۔ شاہدہ الگ رہتی۔ اس لئے کہ



اس کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بھی بہت کم
گفتگو کرتی تھی۔ کلاس میں آتی تو ایک کونے میں بیٹھ جاتی اور بُت سی بنی رہتی۔
بڑا حسین بُت ——— اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کی چھاؤں
رہتی تھی، ساکت و صامت رہتیں۔ لڑکے اسے دیکھتے اور جی ہی جی میں بہت
کڑھتے کہ یہ حُسن خاموش کیوں ہے۔ اس قدر منجمد کس لئے ہے اسے
متحرک ہونا چاہیے۔

اس کا رنگ گورا تھا ——— بہت گورا جس میں تھوڑی سی ملاحت بھی
گھلی ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو شکر کی بنی ہوئی پتلی تھی جو دیوالی کے تہوار پر بکا
کرتی ہیں۔

اس میں مٹھاس تھی، لیکن وہ ظاہر یہ کرنا چاہتی تھی کہ بڑی کڑوی کسیلی ہے
——— کالج میں اس کا رویّہ کچھ اس قسم کا تھا کہ ہر وقت نیم کی نبولی بنی
رہتی تھی۔

ایک دن اس کے ایک ہم جماعت لڑکے نے جرأت سے کام
لے کر اس سے کہا۔ "حضور ——— کلاس میں اپنی جگہ دے کر کبھی کسی
کو سرفراز تو کریں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن اس طالب علم کو پرنسپل نے بلایا

اور اسے نکال باہر کیا۔

اس حادثے کے بعد تمام لڑکے محتاط ہو گئے۔ انہوں نے شاہدہ کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا کہ مبادا ان کا وہی حشر ہو جو اس طالب علم کا ہوا۔

شاہدہ اب بی۔ اے میں تھی۔ خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی ذہین تھی۔ اس کے پروفیسر اس کی ذہانت اور خوبصورتی سے بڑے مرعوب تھے۔ پرنسپل کی چہیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کی بڑی بہن کے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔

کالج میں چہ میگوئیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ شاہدہ کے متعلق قریب قریب ہر روز طالب علموں میں باتیں ہوتی تھیں۔ وہ اس کے متعلق کوئی بری رائے قائم نہیں کر پاتے تھے۔ اس لئے کہ اس کا کیریکٹر بڑا مضبوط تھا۔

ٹک شاپ میں باتیں ہوتیں اور شاہدہ کا حسن زیر بحث ہوتا۔ سب سوچتے کہ یہ حسین قلعہ کون سر کرے گا۔

شاہدہ کو، جیسا کہ سب کو معلوم تھا، صرف خوبصورت چیزیں پسند تھیں۔ وہ کسی بدصورت چیز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ایک دن کلاس میں ایک لڑکے کی رِسٹ واچ بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہدہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔



وہ بڑی نفاست پسند تھی۔ اس کو وہ ہر چیز کھلتی تھی جو بھدا ہو۔

کالج میں ایک لڑکی جمیلہ تھی ــــ بڑی بدصورت، مگر شاہدہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین۔ اس کو وہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ ویسے وہ اس کی ذہانت کی قائل تھی اور کوئی رشک محسوس نہیں کرتی تھی۔

کالج کے سب لڑکے سوچتے تھے کہ شاہدہ اگر حسین نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا ــــ وہ اس سے بات چیت تو کر سکتے۔ مگر وہ اپنے حسن کے غرور میں سرشار رہتی اور کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔

ایک دن کالج میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا ــــ ایک لڑکا جس کے والد کی تبدیلی ہو گئی تھی، اس کالج میں داخلہ لینے کے لئے آیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے اسے دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ وہ شاہدہ سے زیادہ خوبصورت تھا۔

اس کا نام شاہد تھا ــــ اس کو داخلہ مل گیا۔

جس کلاس میں شاہدہ تھی، اسی میں شاہد بھی تھا ــــ اتفاق کی بات ہے کہ جب شاہد پہلے روز کلاس روم میں آیا تو شاہدہ موجود نہیں تھی۔ اس کو زکام ہو گیا تھا اور اس کے باعث اس نے دو روز کے لئے چھٹی لے لی تھی۔

دو دن کے بعد جب شاہدہ کالج کے باغ میں ٹہل رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت، مگر بے جان سی مورت آ رہی ہے۔ اس نے اپنی کتابیں

بنچ پر رکھیں اور آگے بڑھا۔

شاہدہ نے اسے دیکھا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کے قدم رُک گئے۔ زمین گیلی تھی اکیچڑ سی ہو رہی تھی شاہد جب اس کی طرف بڑھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ اس گھبراہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔

شاہد نے لپک کر اسے اٹھایا ——— شاہدہ کے گھٹنے میں موچ آگئی تھی مگر اس نے مسکرا کر کہا "شکریہ ——— آپ کون ہیں؟"

شاہد نے جواب دیا "ایک خادم!"

"آپ خادم تو دکھائی نہیں دیتے"

"کیا دکھائی دیتا ہوں ——— بعض اوقات یہ شکلیں غلط دکھائی دیا کرتی ہیں۔"

شاہدہ کو یہ بات پسند آئی۔ اس کے گھٹنے میں بہت درد ہو رہا تھا مگر وہ اسے چند لمحوں کے لیے بھول گئی "آپ کا نام؟"

"شاہد"

شاہدہ نے سوچا کہ شاید وہ اس کا نام سن چکا ہے اور شرارت کے طور پر شاہد بن رہا ہے "آپ غلط کہہ رہے ہیں۔"



"آپ کالج کے رجسٹر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہیں"

"آپ اس کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں ——— آپ یہاں کیسے چلی آئیں؟"

"واہ ——— میں بھی تو یہیں پڑھتی ہوں"

"کس کلاس میں؟"

"بی اے میں!"

"میں بھی تو بی اے میں ہوں۔"

"جھوٹ ——— آپ تو مالی معلوم ہوتے ہیں"

"اس شکل کے آدمی واقعی مالی معلوم ہوتے ہیں ——— لیکن افسوس ہے کہ میں نے ابھی تک کوئی پھول نہیں توڑا؟"

"پھول کیا توڑنے کے لیے ہوتے ہیں ——— انہیں تو صرف سونگھنا چاہیے"

شاہد ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا "میں آپ کو سونگھ رہا ہوں"

شاہدہ جھینپ گئی "آپ بڑے بدتمیز ہیں۔"

شاہد نے بنچ پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا "میں نے

آپ کو ہرایا تو نہیں — صرف سُن لگا لیا ہے — اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی
چٹکیوں میں سے غرور کی بُو آتی ہے — وہ معاف کیجئے گا۔ خود میں کرسکتا
ہوں۔ لیکن مردوں کے ساتھ — میں بھی ایک پھول ہوں، پر آپ کا ہی۔
میں آپ سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

شاہدہ اپنا ٹخنہ پکڑے بیٹھی تھی۔ ایک دم کراہنے لگی۔ "ہائے — ہائے
بڑا درد ہو رہا ہے۔"

شاہد نے اس سے اجازت طلب کی۔ "کیا میں اسے دبا دوں؟"

"دبائیے — خدا کے لئے دبائیے۔"

شاہد نے اس کے موچ آئے ہوئے ٹخنے پر اس طریقے سے مساج کیا کہ
پندرہ منٹ کے اندر اندر شاہدہ کا درد دور ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد کالج میں وہ دونوں خالی پیریڈوں میں اکٹھے باہر
جاتے اور باغ میں بیٹھ کر جانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ شاید وہ یہ کوشش
کر رہے تھے کہ دونوں گیلی زمین پر پھسلیں اور ان کے دل کے ٹخنوں میں
موچ آجائے اور وہ ساری زندگی ان کو سہلاتے رہیں۔

دونوں نے بی اے پاس کر لیا۔ بڑے اچھے نمبروں پر۔ شاہد کے نمبر شاہدہ
کے مقابلے میں پانچ زیادہ تھے۔ اس نے اس کا بدلہ لینا چاہا۔ "شاہدہ! میں



یہ پانچ نمبر ابھی لے لیتا ہوں۔"

"کیسے؟"

شاہد نے اس کو پہلی مرتبہ اپنی گود میں اٹھایا اور اس کو پانچ مرتبہ چوم لیا۔

شاہدہ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس
نے شاہد سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہمارے نمبر پورے ہو گئے۔ لیکن آج کے اس
واقعے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کی میری شادی ہو جانی
چاہیے — میں اپنے ہونٹ اب کسی اور کے ہونٹوں سے
آلودہ نہیں کروں گی۔"

شاہد بہت خوش ہوا۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ اس کی دلی آرزو
کبھی پوری ہو گی۔ اس نے اسی خوشی میں پانچ نمبر اور حاصل کئے اور
شاہدہ سے کہا۔ "میری جان! میں اسی امید میں تو اب تک جیتا رہا ہوں۔"

شاہدہ کے والدین نے اس کی شادی کی ایک جگہ بات چیت کی۔
مگر شاہدہ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی بدصورت مرد سے رشتہ ازدواج
قائم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

بہت جھگڑے ہوئے۔ آخر شاہدہ نے بتا دیا کہ وہ اپنے ہم جماعت
شاہد کو جو بہت خوش شکل ہے، پسند کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مرد

کہ اپنی رفاقت میں نہیں رہے گی۔

اس کے ماں باپ شاہد کے والدین سے ملے۔ بڑے شریف اور متحمل آدمی تھے ——— اور روشن خیال بھی۔

شاہد کو جب انہوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت جا رہا تھا۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ پہلے شادی کر لے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائے تاکہ وہ بھی باہر کی دنیا دیکھے۔

جب والدین رضامند ہو گئے تو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھے۔ پہلی رات شاہد نے اپنی بیوی سے کہا "ہمارا بچہ ——— لڑکی ہو یا لڑکا ——— جب پیدا ہو گا تو اسے دنیا دیکھنے آئے گی"۔

شاہدہ نے پوچھا "کیوں؟"

شاہد ہنسا "میری جان! تم اتنی حسین ہو ——— میں بھی کچھ بدشکل نہیں۔ ہمارا بچہ یقیناً ہم دونوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گا"۔

ہنی مون منانے کے لئے وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ وہ وہاں چار مہینے رہے۔ اس کے بعد لندن چلے گئے جہاں شاہد کو پی ایچ ڈی کی ڈگری لینا تھی۔

شاہد کے باپ میاں ہدایت اللہ کی وہاں ایک کوٹھی تھی جو ان کی



آمد سے پہلے ہی خالی کرا لی گئی تھی ——— شاہدہ بہت خوش تھی اور شاہد بھی۔ اس لئے کہ وہ ایک بچے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

شاہد کہتا تھا "ہمارا بچہ اتنا حسین اور خوبصورت ہو گا کہ اس کا جواب نہ ہو گا"۔

شاہدہ کہتی "خدا نظرِ بد سے بچائے ——— خود گل گوتھنا سا ہو گا"۔

پورے دن ہوئے تو بچہ ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ شاہد نے اپنی بیوی کو میٹرنٹی ہوم میں داخل کرا دیا۔

لیبر وارڈ کے باہر شاہد بڑے اضطراب میں ادھر ادھر چل رہا تھا ——— اس کی نظروں کے سامنے ایک ایسے بچے کی تصویر تھی جس کے خدوخال اس کے اور اس کی بیوی کے آپس میں بڑے حسین طور پر مدغم ہو گئے ہوں۔

لیبر وارڈ سے نرس باہر آئی۔ شاہد نے لپک کر اس سے پوچھا "خیریت ہے؟"

"جی ہاں!"

"لڑکا ہوا یا لڑکی؟"

نرس پریشان سی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا: "پتہ نہیں لڑکا ہے یا لڑکی — پر ہم نے ایسا بچہ کبھی نہیں دیکھا۔"

شاہد نے خوش ہو کر پوچھا: "بہت خوبصورت ہے نا؟"

نرس نے منہ بنا کر جواب دیا: "بڑا اگلی ہے — اس کے سر پر ایسا معلوم ہوتا ہے سینگ ہیں۔ دانت بھی ہیں — ناک بھی ٹیڑھی ہے — دو آنکھیں ہیں، پر ایک آنکھ ایسا لگتا ہے ماتھے پر بھی ہے — تم لوگ اتنے خوبصورت ہو کر کیسے بچہ پیدا کرتا ہے۔"

شاہد اپنے بچہ کو دیکھنے کے لئے گیا لیکن دوسرے دن میٹرنٹی ہوم میں ٹکٹ لگا دی گئی کہ جو آدمی چاہے اس عجیب الخلقت بچہ کو دیکھ سکتا ہے۔

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحبِ عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے۔ اس لئے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے

حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض لوگ اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ۔۔۔
ذرا ٹھہریئے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت سُن تو نہیں رہا۔۔۔ نہیں نہیں ٹھیک
ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے
چھ بجنے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔"

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ
بہت دکھ دیتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں
کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول
تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں
کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کیا
جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں۔
لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف
بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے
ایک ہی وقت گیارہ مئی سنہ ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی



کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے۔ جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے
تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں، اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد
ہوں، میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے، اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا۔
تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔
شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹشے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت
سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اس کے
والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔
ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا۔ اس کا
اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا
تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ۳½ فٹ
ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر
تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت
میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس لئے

کر وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں جیسا
ایسا سلوک کریں۔ لیکن یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب
اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنئے۔ وہ اول درجے کا فراڈ ہے
پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے سے
متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی
دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید
تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس
کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ
سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ
سن کر ہنستا ہوں۔ اس لئے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے
پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جالی والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے
ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے
وہ لٹھ مار ہے۔ لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں اس نے بڑی خوشی سے



برداشت کئے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاہلوں کی لٹھ بازی نہیں ہے
وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی
سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب
گرا، اب گرا ـــ لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا ـــ شاید گر جائے
اوندھے منہ ..... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں
سے کہے گا کہ میں اسی لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا
مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا، خود افسانہ
اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے
افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا
ہوتا ہے۔ لیکن وہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔
اس کے دوست یار بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں
اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیے جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں
چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے
وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو۔ کوئی دکان کھول لو

لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں بنیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے اس لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے' جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ "اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے لیکن خفگی نہیں کی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے۔ لیکن صرف چند منٹوں کے لئے۔ اور وہ چند منٹ، اللہ کی پناہ......"

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لئے..... کہ اس کا ہمزاد ہوں ـــــ کہ وہ فراڈ کر رہا ہے۔ اس نے ایک جگہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوتے ہیں۔ "حقیقت اس کے برعکس ہے۔" جب اسے افسانہ لکھنا ہو گا تو وہ رات کو سوچے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا۔ لیکن اسے ناکامی ہو گی پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن ناکام رہے گا۔ پھر



جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہو گی تو پان لینے کے لئے چلا جائے گا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا۔ لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا۔ اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ہتک۔ ممی۔ موذیل۔ یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔" یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گندے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ...... اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔" یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی سے توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔"

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں جو چند الفاظ میں بیان کئے
دیتا ہوں۔ وہ چور ہے — جھوٹا ہے — دغا باز ہے اور مجمع گیر ہے۔
اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی
سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ دیکھتا رہا
کہ اس نے کہاں رکھے ہیں، اور دوسرے دن ان میں سے ایک سبزہ
غائب کر دیا۔ اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے
نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے
اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اول درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع
میں اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک
خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے
کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا — جھوٹ تھا۔ منٹو جھوٹ بقدر کفایت بولتا
ہے لیکن اس کے گھر والے، مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس
کی ہر بات جھوٹی ہے — اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال
پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں



کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف
نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے
کی بات یہ ہے کہ لوگ — میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ
ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی دوسرے
شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب
چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہئے۔ اس کو خود سمجھنا چاہئے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔
بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔
"میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر
فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے
لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پائدان ہے جو خود کو
جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔
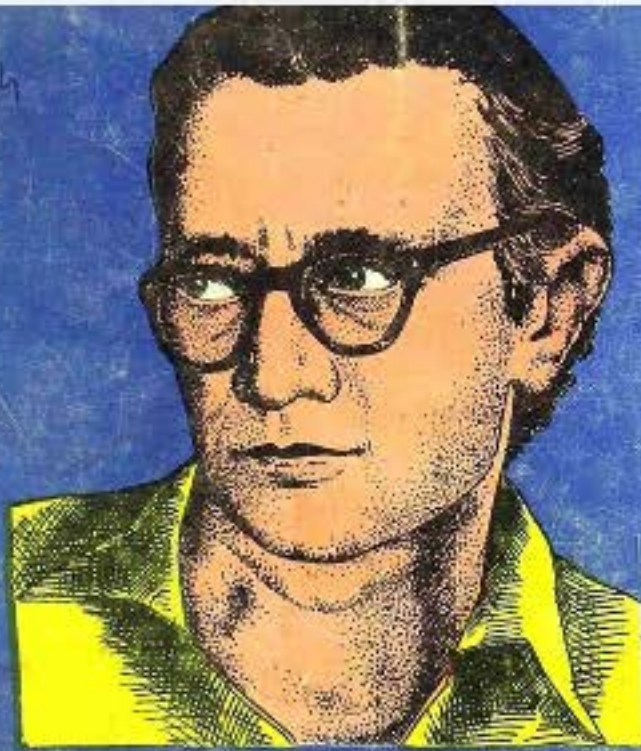
...... زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر
آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ
ان کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ
برداشت ہے...... مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں
میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا
جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے......
منٹو



کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف
نام ہی جانتا ہے۔ ہیولاک ایلیس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے۔ لیکن مزے
کی بات یہ ہے کہ لوگ ـــــ میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ
ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی دوسرے
شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب
چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے۔ اس کو خود سمجھنا چاہیے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے
بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔

"میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر
فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے
لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پائیدان ہے جو خود کو
جھاڑتا پھٹکارتا رہتا ہے۔